انتہا پسند اسلام کا شجرۂ نسب

تحریر: کوئنٹان وِکٹروز*

ترجمہ: خورشید احمد سعیدی

ان انتہاء پسند نظریات کا شجرۂ نسب جو القاعدہ کے نزدیک تشدد کو جائز قرار دیتے ہیں یہ ظاہر کرتا ہے کہ گزشتہ کئی عشروں کی جہادی فکر کی ترقی ان حدود کے خاتمے کی وجہ سے ہوئی ہے جو کلاسیکل اسلام میں جنگ اور تشدد کو محدود کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ ان حدود اور ان کے خاتمے کی وضاحت ان جہادی دلائل کے ارتقاء سے ہوتی ہے جو ارتداد اور مقامی و عالمی سطح پر جہاد اور عوام کو نشانہ بنانے اور خودکش حملوں سے متعلق دیے جاتے ہیں۔

تعارف

القاعدہ اور وہ انتہائی بنیاد پرست گروہ جو نئی ''عالمی جہادی تحریک'' کی تشکیل کرتے ہیں وہ مذہبی اعتبار سے کوئی بیرونی عناصر نہیں ہیں۔ وہ اسلام پسندوں کے ایسے وسیع طبقے کا ایک حصہ ہیں جو سلفی کے نام سے معروف ہیں اور جنہیں عام طور پر 'وہابی' بھی کہا جاتا ہے۔ سلفی کی اصطلاح اُن لوگوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو محمد نبی [صلی اللہ علیہ وسلم] کے صحابہ [رضی اللہ تعالیٰ عنہم] (سلف) کے طریقے کی پیروی کرتے ہیں۔ سلفی یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ چونکہ صحابہ نے اسلام براہ راست نبی [صلی اللہ علیہ وسلم] سے سیکھا اس لیے وہ ایمان کا حقیقی فہم رکھتے تھے۔ تاہم اس کے برعکس بعد میں مسلمانوں کے اعمال بدعتوں اور جدید مذہبی رسوم کی وجہ سے عیب دار ہو گئے جنہوں نے وقت کے ساتھ ساتھ مسلمان قوم کی اصلیت کو آلودہ کر دیا۔ اس نتیجے کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان ہر صورت میں قرآن، سنت اور اجماع صحابہ پر عمل کرتے ہوئے

*Quintan Wiktorowigz, "A Genealogy of Redical Islam", *Studies in Conflict and Terrorism*, 28: 75-97, 2005, Routledge Taylor & Francis Group.

دین کو خالص بنائیں۔ صرف ان دینی مصادر کی بناء پر ہی کسی عمل کو جائز قرار دینا چاہیے۔

اگرچہ سلفیوں کے درمیان اس اسلامی فہم کے بارے میں اتفاق رائے پایا جاتا ہے پھر بھی تشدد کے استعمال پر ان کے ہاں اختلاف موجود ہے۔ جہادی عناصر یقین رکھتے ہیں کہ اسلامی ریاستوں کے قیام اور امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے مقابلے کے لیے تشدد کا ہتھیار استعمال کیا جا سکتا ہے۔ دوسری جانب تشدد کو ناپسند کرنے والے سلفی تشدد کے استعمال کو سختی سے رد کرتے ہیں اور اس کی بجائے دعوت وارشاد کے ذریعے مسلم ممالک کے حکمرانوں کی اصلاح کا مشورہ دیتے ہیں۔ یہ دونوں گروہ سلفی طبقے کے اندر بہت اہم تقسیم کی نشاندہی کرتے ہیں۔ تاہم ان کے اندر کچھ ایسے افراد اور تحریکیں بھی ہیں جو ان دونوں دھڑوں میں سے کسی میں بھی شامل نہیں کیے جا سکتے۔ مثلاً ان مؤثر شخصیات میں محمد سرور (حال لندن)، سفر الحوالی اور سلمان العودہ شامل ہیں۔

جہادی انتہاء پسندوں کے شجرۂ نسب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ سلفی طبقے میں کلیدی اختلاف کی شناخت کی جائے۔ نبی [صلی اللہ علیہ وسلم] اور ان کے صحابہ [رضی اللہ تعالیٰ عنہم] کے نمونہ کی سختی سے اتباع ایک قدر مشترک ہے تاہم اس کے بعد ان میں کون کون سے بڑے اختلافات موجود ہیں؟ اس مقالے میں سلفیوں کے درمیان درج ذیل چار بڑے متنازع نکات کی وضاحت کی گئی ہے:

(۱) کیا مسلمان اپنے رہنماؤں کو بے دین کہہ کر ان کے خلاف جہاد شروع کر سکتے ہیں؟

(۲) ایک ''دفاعی'' اور عالمی جہاد کی نوعیت کیا ہے؟

(۳) عوام کو نشانہ بنانے کا جواز کیا ہے؟

(۴) خودکش حملوں کا جواز کیا ہے؟ جنہیں انتہاء پسند ''شہادت آپریشن'' کا نام دیتے ہیں۔

ان مسائل پر انتہاء پسند عناصر دیگر سلفیوں سے کیوں اور کیسے الگ ہو جاتے ہیں؟ ان مختلف نظریاتی رجحانات کی حمایت کس نے کی؟ اور وقت کے ساتھ ساتھ ان انتہاپسند رجحانات کی تشکیل کیسے ہوئی؟

بڑی حد تک ان سوالوں کے جواب اس روایتی موضوعی طریقہ کار میں تلاش کیے جا سکتے ہیں جو غیر متبدل مذہبی متون کی تشریح کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ اور جس کے ذریعے ان تشریحات کا اطلاق نئی صورت حال اور مسائل پر کیا جاتا ہے۔ قرآن اور نبی [صلی اللہ علیہ وسلم] کی سنت میں سیاست، معیشت،

معاشرے اور انفرادی طرزِ عمل کے بارے میں کئی قواعد ملتے ہیں لیکن یہ جدید دور کے کئی سوالوں کا جواب براہِ راست نہیں دیتے۔ چنانچہ سلفی (اور دوسرے مسلمان) اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں کہ نبی [صلی اللہ علیہ وسلم] اگر آج زندہ ہوتے تو وہ کیا کرتے اور کس طرح معاصر معاشرے کو درپیش مسائل کا جواب دیتے؟ یہ اجتہاد اور قیاس پر مبنی استنباط کا طریقۂ کار ہے۔ مثال کے طور پر نبی [صلی اللہ علیہ وسلم] بڑے پیمانے پر تباہی کے ہتھیاروں کے استعمال کے بارے میں کیا فرماتے؟ قرآن اور سنت سے اس مسئلے کا براہ راست جواب نہیں ملتا۔ تاہم بعض انتہاء پسند یہ دلیل دیتے ہیں کہ اگر آپ [صلی اللہ علیہ وسلم] آج زندہ ہوتے تو بڑے پیمانے پر تباہی کے ہتھیاروں کے استعمال کی حمایت فرماتے۔ بالخصوص وہ محاصرۂ طائف کا حوالہ دیتے ہیں جس میں پیغمبر نے فصیل والے ایک شہر کے خلاف منجنیق کے استعمال کی اجازت دی جہاں دشمن فوجی اور عام شہری اکٹھے رہ رہے تھے۔ اسے جہادی ''اس دور کا بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والا ہتھیار'' کہتے ہیں۔ دلائل دینے کے اس طریقہ سے اس بارے میں مختلف آراء سامنے آتی ہیں کہ موجودہ مسائل کا جواب نبی [صلی اللہ علیہ وسلم] کیسے دیتے۔

اس طریقۂ کار کی موضوعی نوعیت کو مصر میں شوریٰ کونسل اور جامعہ اسلامیہ کے ملٹری ونگ کے ایک رکن نے جون ۲۰۰۲ء میں ایک گروپ انٹرویو کے دوران بہتر انداز میں واضح کیا ہے۔ اس انٹرویو میں رہنماؤں نے وضاحت کی کہ انہوں نے اس پر تشدد جدوجہد کو کیوں ترک کیا جس کا آغاز نوے کی دہائی کے اوائل میں شروع ہونے والی تحریک سے کیا گیا تھا۔

''شریعت کو حقائق سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ درست نصوص کا مناسب حقائق پر نفاذ کرنے سے پہلے آپ حقائق اور متعلقہ نصوص دونوں کا لازماً گہرا مطالعہ کریں۔ غلطیاں اس سبب سے ہوتی ہیں کہ درست نص بعض اوقات غیر متعلقہ حقیقت پر لاگو کر دی جاتی ہے''۔

ان رہنماؤں نے مثال کے طور پر تحریک کے بعض اراکین کی طرف سے قبطی عیسائیوں کی جائیداد چھین لینے کے فیصلے کا حوالہ دیا۔ انہوں نے کہا کہ: ''جس شخص نے یہ کیا تھا اس نے غلط واقعہ پر بعض نصوص کا اطلاق کیا تھا۔ کفار کے مال و جائیداد پر قبضہ کر لینے کا اسلامی حکم کفار کے ساتھ جنگوں کے دوران لاگو ہوتا ہے، جیسا کہ ۱۹۷۳ء میں یہودیوں کے خلاف جنگ کیونکہ یہ ایک واضح جنگ تھی۔ جہاں تک اس اصول

کوان شہریوں پر لاگو کرنے کا تعلق ہے جو اس ملک کی آبادی کا ایک حصہ ہیں، تو یہ غلط ہے''۔

گزشتہ چند عشروں کے دوران جہادی فکر کے ارتقاء کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں بہت سی تبدیلیاں مذہبی نصوص اور متعلقہ اصولوں کی نئی تعبیر کے نتیجے میں نہیں بلکہ حالات کی نئی تفہیم کے نتیجے میں کی گئی ہیں۔ دوسرے سلفیوں کی طرح جہادی انہی نصوص، حوالوں اور دوسری مذہبی شہادتوں کا استعمال کرتے ہیں لیکن انہوں نے مثلاً ''عقیدے''، ''جارحیت'' کے خلاف دفاع اور ''عوام'' کے حوالے سے حالات وحقائق اور تصورات کو نیا مفہوم دیا ہے۔ جہادی فکر کے ارتقاء میں مذہبی نصوص اور بنیادی اصولوں میں تبدیلی کم کی گئی ہے بلکہ یہ ارتقاء دور حاضر میں ان اصولوں کو نافذ کرنے کے طریقوں میں ہوا ہے۔

اس سے قطعاً یہ مراد نہیں ہے کہ مذہبی علم مکمل طور پر غیر متعلق ہے۔ یقیناً بعض مفکرین مثلاً تقی الدین ابن تیمیہ (۱۲۶۳-۱۳۲۸ء)، محمد بن عبدالوہاب (۱۷۰۳-۱۷۹۲ء)، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳-۱۹۷۹ء) اور سید قطب (۱۹۰۶-۱۹۶۶ء) نے مذہبی نصوص کی نئی تعبیرات پیش کیں جو غالب تشریحات کو چیلنج کرتی ہیں۔ لیکن بعد کے اکثر مفکرین نے صرف ان مفاہیم کو نئے مسائل کے ساتھ ہم آہنگ کیا۔ یعنی ان تعبیرات کو کھینچ تان کر ایسے منطقی نتیجے پر پہنچایا جس سے جائز تشدد کی گنجائش میں اضافہ ہو گیا۔

تکفیر/ ارتداد کے الزامات اور اپنے ملک ہی میں جہاد کا آغاز

مسلمانوں کی بھاری اکثریت کسی کو کافر کہنے میں قدامت پرست ہے۔ یہ عمل تکفیر کہلاتا ہے۔ کئی قرآنی تنبیہی عبارات اور نبی [صلی اللہ علیہ وسلم] کی احادیث سے اس مسئلے کی سنجیدگی کو سمجھا جا سکتا ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

اگر ایک مسلمان کسی کو کافر کہتا ہے تو اگر وہ فی الواقع کافر ہے تو کوئی بات نہیں وگرنہ دوسرے کو کافر کہنے والا خود کافر ہو جائے گا (سُنن ابوداؤد)۔

کوئی شخص کسی دوسرے کو گناہگار یا کافر ہونے کا الزام نہیں لگاتا مگر یہ کہ یہ الزام اسی کہنے والے پر لوٹ آتا ہے اگر دوسرا فی الحقیقت ایسا نہیں تھا (بخاری، کتاب الاخلاق)۔

اپنی زبانیں ان لوگوں کو کوئی بری بات کہنے سے روکے رکھو جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ انہیں کافر مت کہو۔ جو کوئی کسی کلمہ گو کو کافر کہتا ہے قریب ہے کہ خود کافر ہو جائے (بروایت ابن عمر)۔

اکثر مسلمانوں کا ایمان ہے جیسا کے نبی [صلی اللہ علیہ وسلم] نے فرمایا: ''جو کوئی ایک ایمان دار پر بے ایمانی کا الزام لگاتا ہے یہ ایسے ہے گویا کہ اس نے اسے قتل کر دیا''۔ اس لیے جب تک ایک لیڈر کے دل میں ''رائی کے ایک دانے کے برابر ایمان'' ہے اور وہ نماز ادا کرتا ہے وہ اس وقت ایک مسلمان ہی تصور کیا جائے گا۔ (اس پورے مقالے میں اسم ضمیر ''وہ'' (he) استعمال کیا گیا ہے کیونکہ یہ جہادی معیار ہے۔ تاہم یہ ماننا چاہیے کہ یہ مرد اور عورت دونوں کو شامل ہے)۔ اس تناظر میں کوئی لیڈر اس وقت کافر بنتا ہے جب وہ جان بوجھ کر غیر اسلامی قانون کا نفاذ کرتا ہے اور وہ اچھی طرح یہ سمجھتا ہے کہ وہ قانون اسلام کی نمائندگی نہیں کرتا اور وہ یہ اعلان بھی کرتا ہے کہ یہ قانون اسلامی قانون سے بہتر ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور لیڈر ناواقف، مجبور، یا ذاتی منفعت سے مجبور ہو سکتا ہے، یا اس میں ایسی کمزوریاں ہو سکتی ہیں جو گناہ تو شمار ہو سکتی ہیں لیکن اسے کافر نہیں کہا جا سکتا۔ سلفیوں کی اکثریت کے ہاں دلیل کا یہ انداز اختیار کیا جاتا ہے۔

ارتداد یا کفر میں ارادے کا واضح ثبوت سامنے آنا ضروری ہے جو اکثر صورتوں میں تقریباً ناممکن ہے جب تک کوئی حکمران کھلم کھلا اپنے کفر کا اعلان نہ کرے۔ غیر متشدد سلفیوں نے تکفیر کے فیصلے کے لیے درحقیقت ایک پیچیدہ طریق کار وضع کیا ہے جو کسی کو مرتد کہنے کے لیے انتہائی مشکل ہے۔ وہ کسی شخص پر کفریہ عمل کے ارتکاب کا الزام تو لگا سکتے ہیں لیکن جب تک وہ شخص اپنے عمل کے غیر اسلامی ہونے کا واضح ثبوت ہوتے ہوئے بھی اس کے اسلامی ہونے کا اعلان کرے یا نہ کہے کہ، اس کا عمل اسلام سے بہتر ہے وہ مسلمان رہتا ہے۔ ایسا مجرم اگر مرنے سے پہلے توبہ نہ کرے تو جہنم میں جا سکتا ہے لیکن اس کا فیصلہ کرنا خدا کا کام ہے۔

غیر متشدد سلفیوں کا یہ بھی ایمان ہے کہ حکمرانوں کے خلاف لڑنا ممنوع ہے۔ ان کی اکثریت دوسرے مسلمانوں کے قتل کی متفق ممانعت کا حوالہ دیتی ہے جیسا کہ قرآن (۹۲:۴) میں کہا گیا ہے: ''کسی

مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ مسلمان کو قتل کرے مگر یہ کہ وہ غلطی سے ہو جائے''۔

ارتداد کے متعلق موجودہ جہادی دلیل مصر اور سعودی عرب کے دانشوروں کی وضع کردہ ہے۔ مصری سوچ کا سلسلہ نسب برطانیہ کے زیر قبضہ انڈیا سے ملتا ہے۔ قدامت پرست ہندوستانی مسلمانوں کو پریشانی یہ تھی کہ اسلام قبول کرنے والے بہت سے ہندو اپنی سابقہ ثقافتی رسومات کو جاری رکھے ہوئے تھے اور یہ کہ اہل تشیع اور انگریز اہل سنت کے خالص اسلام کو کمزور کر رہے تھے۔ سخت موقف رکھنے والے مسلمانوں نے ''سچے مؤمنوں'' اور کفار بشمول اسلام کی بے لچک تشریح سے منحرف مسلمانوں کے درمیان ایک واضح خطِ امتیاز کھینچ کر ردعمل کا اظہار کیا۔ انتہاء پسند سُنی گروہ جو اس تناظر کی حمایت کرتا تھا جنوبی ہندوستان میں ۱۸۲۰ء اور ۱۸۳۰ء کے درمیان ابھرا۔ سید احمد رائے بریلوی کی زیر قیادت تحریک بھی انہیں میں شامل تھی۔ ان گروپوں کی جانب مائل قدامت پرستوں کو انگریزوں نے جزیرۂ عرب میں ابھرنے والے کٹر مذہبی فرقہ کے نام پر ''وہابی'' کا نام دیا۔

یہ قدامت پرست مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے فکری پیش رو تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے ہی ۱۹۳۰ء کی دہائی میں سید احمد رائے بریلوی کے فہم کو جدید قالب میں ڈھالا۔ جبکہ [فرق یہ ہے کہ] رائے بریلوی اور دیگر ان کے ہم نوا ہر مغربی شے کو اسلام مخالف قرار دے کر رد کرتے تھے۔ جبکہ مودودی نے مغربی ٹیکنالوجی، سائنس اور جدیدیت کے دوسرے پہلوؤں کا مناسب استعمال کرتے ہوئے اسلام کے مبادی کی طرف لوٹنے پر زور دیا۔ جدت پسندوں کے نزدیک مغرب کے مثبت پہلو مغربی استعمار کے خلاف مسلمان قوم کو مضبوط بنانے کے لیے استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ابتدائی قدامت پرستوں سے اختلاف کے باوجود مودودی نے رائے بریلوی اور ان کے پیروؤں کے اختیار کردہ ایمان اور بے دینی کے درمیان سخت خط امتیاز کو قبول کیا۔

مودودی کی تحریروں میں قرون وسطیٰ کے مشہور سلفی عالم تقی الدین ابن تیمیہ کا بہت گہرا اثر موجود ہے، خاص طور پر خدا کے مقتدر اعلیٰ ہونے پر اس کی تحریروں سے انہوں نے خاصا اخذ و استفادہ کیا ہے۔ سلفی فکر میں ابن تیمیہ کا سب سے اہم حصہ تصورِ توحید کی تشریح ہے۔ اس نے توحید الٰہی کو دو اقسام میں تقسیم کیا: توحید الوہیت اور توحید عبادت۔ پہلی قسم کی توحید خدا کے بارے میں اس ایمان کی طرف اشارہ کرتی

ہے کہ وہ حقیقی مقتدر اور خالقِ کائنات ہے۔ تمام مسلمان بلا تاخیر اسے قبول کرتے ہیں۔ دوسری طرح کی توحید خدا کے بارے میں یہ کہتی ہے کہ وہ اکیلا عبادت اور فرمانبرداری کا مستحق ہے۔ ابن تیمیہ نے یہ دلیل دی کہ توحید الٰہی کی یہ دوسری قسم خدا کے قوانین پر عمل کو لازم قرار دیتی ہے۔ انسانوں کے وضع کردہ قوانین پر عمل غیرِ خدا کی اطاعت یا فرمانبرداری کے مترادف ہے اور اس لیے یہ ارتداد ہے۔ مودودی نے یہ موقف قبول کیا اور ''حزب اللہ'' اور ''حزب الشیطان'' کے درمیان ایک نمایاں نقطۂ امتیاز کھینچ دیا اور اس طرح انہوں نے انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو ماننے والے مسلمانوں کو بھی شیطان کے ٹولے میں شامل کر دیا۔

اپنی اس دلیل کی تشکیل کے وقت مودودی نے اپنا ''جدید جاہلیت'' کا تصور ۱۹۳۹ء میں پیش کیا۔ جاہلیت کی یہ اصطلاح آمد اسلام سے قبل دور جاہلیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ انہوں نے دلیل دی کہ خود کو مسلمان کہنے والوں کا انحراف، استعماری طاقتوں کے اثرات اور غیر اسلامی قوانین کا استعمال اس ابتدائی دورِ جاہلیت کے مماثل ہے۔ مودودی کے نزدیک سچے مسلمانوں کو اس جاہلیت کے خلاف جدوجہد کرنی چاہیے بالکل اسی طرح جس طرح نبی [صلی اللہ علیہ وسلم] اور ان کے صحابہ نے مکہ میں غالب قبیلہ قریش کے کفر و الحاد کے خلاف جدوجہد کی تھی۔ اپنی جدوجہد کا آغاز ۱۹۴۱ء میں انہوں نے جماعت اسلامی کی بنیاد رکھ کر کیا۔ یہ ایک ایسا مقدمہ الجیش ہے جو زمین پر خدا کے اقتدار اعلیٰ کو نافذ کرنا لازمی سمجھتا ہے۔ مصر میں اسلام پسندوں کے لیے مودودی اس لیے اہم ہیں کہ انہوں نے سید قطب پر اثرات ڈالے۔ سید قطب کو عموماً انقلابی سنی اسلام کا امام سمجھا جاتا ہے۔ انہیں جمال عبدالناصر نے ۱۹۶۶ء میں سزائے موت دے دی تھی۔

قطب نے مودودی کی انتہائی مؤثر کتابیں پڑھیں جن میں ''الجہاد فی الاسلام''، ''اسلام اور جاہلیت'' اور ''اسلامی ریاست'' شامل ہیں۔ ان کتب کا ۱۹۵۰ء کے آغاز ہی میں عربی میں ترجمہ ہو گیا تھا۔ ایک مزید بڑا اور براہ راست رابطہ مودودی کے خوشہ چین ابوالحسن علی ندوی کے ذریعے قائم تھا جو ان کے نظریات کو عرب دنیا تک منتقل کرنے میں ایک مرکزی کردار تھے۔ ۱۹۵۰ء میں ندوی نے ''عالم اسلام کے زوال کے باعث دنیا نے کیا کھویا؟'' کے نام سے عربی میں ایک کتاب لکھی جس میں مودودی کے نظریہ

''جاہلیت جدید'' کی توضیح وتشریح کی۔ جب ۱۹۵۱ء میں پہلی بار انہوں نے مشرق وسطی کا سفر کیا تو سید قطب سے بھی ملاقات کی جنہوں نے پہلے سے ان کی کتاب پڑھ رکھی تھی۔ سید قطب نے اپنی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' مطبوعہ ۱۹۵۳ء میں مودودی اور ندوی کے طویل اقتباسات/حوالے درج کیے۔

''فی ظلال القرآن'' میں جدید جاہلیت کے متعلق قطب نے اپنا نقطۂ نظر مجملاً بیان کیا ہے جس کی مدد سے حکمرانوں کو مرتد قرار دے کر ان کے خلاف جہاد شروع کرنے کے لیے بنیاد فراہم ہوتی ہے:

جاہلیت انسان کے اوپر انسان کی حاکمیت پر یا اللہ کی بجائے انسان کی ماتحتی اور اطاعت شعاری پر دلالت کرتی ہے اس میں خدا کی الوہیت کا انکار اور انسانوں کی خوشامد پائی جاتی ہے۔ اس معنی میں جاہلیت محض ایک خاص تاریخی دور تک محدود نہیں ہے جو قبل از اسلام کے دور کی طرف اشارہ کرتا ہے بلکہ یہ ایک صورت احوال ہے۔ انسانوں کے معاملات کی یہ صورت حال ماضی میں بھی تھی، حال میں بھی ہے اور یہ مستقبل میں بھی ہو سکتی ہے۔ جاہلیت کی شکل اختیار کر کے یہ اسلام کے جانی دشمن کی تصویر پیش کرتی ہے۔ ہر دور اور مقام پر انسانوں کو دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ یا تو مکمل طور پر اللہ کے قوانین کا اطلاق ونفاذ یا پھر کسی نہ کسی نسل کے انسان کے وضع شدہ قوانین کا نفاذ۔ مؤخر الذکر صورت میں لوگ حالت جاہلیت میں ہیں۔ انسان ایک چوراہے پر کھڑا ہے اور اسے اسلام یا جاہلیت میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے صنعتی معاشروں میں جدید طرزِ جاہلیت خانہ بدوش اور کافر عرب کی قدیم طرز جاہلیت کے لازماً مشابہ ہے کیونکہ دونوں نظاموں میں انسان اللہ کی بجائے انسان کے ماتحت ہے۔

قطب نے مودودی کی ''جاہلیت جدیدہ'' اور ابن تیمیہ کی دلیل کو جمع کر دیا ہے جس کے مطابق اللہ کی توحید کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان قانون الٰہی کی پیروی کریں۔ اس نے ان اجزاء کو اس طرح جوڑا ہے جو حزب اللہ اور حزب الشیطان کے درمیان خطِ امتیاز کو مزید مستحکم کر دیتے ہیں: وہ تمام لوگ جو شریعت اسلامیہ کے ذریعے اپنے ایمان کو اپنے اعمال سے ظاہر نہیں کرتے اور احکاماتِ خداوندی کی پابندی سے فرمانبرداری نہیں کرتے وہ سب کے سب جدید جاہلیت کا حصہ ہیں اور مسلمان نہیں ہیں۔ شرق اوسط کے سیاق میں اس کا مطلب ارتداد ہے کیونکہ ''طبقۂ جاہلیت'' کے اکثر لوگ مسلمان پیدا ہوئے تھے۔

تاہم جدید جاہلیت کے لیے قطب کا حل مودودی کے حل سے بالکل مختلف ہے۔ مودودی نے نظام کے اندر رہتے ہوئے کام کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور اصلاح کو پروان چڑھانے کے لیے ایک سیاسی جماعت اور سماجی تحریک قائم کی۔ جبکہ قطب نے ایک اسلامی ریاست قائم کرنے کے لیے جہاد کی وکالت کی۔ ایسا کرتے ہوئے انہوں نے مقبول عام ان اسلامی قانونی آراء کے خلاف دلیل دی کہ جہاد بنیادی طور پر (جہاد بالنفس) یا اپنے نفس کے خلاف جدوجہد کا نام ہے یا مسلمانوں کے تحفظ کے لیے ایک دفاعی جنگ ہے۔ ان کی دلیل ہے کہ جور وستم کے سلسلے کو ختم کرنے لیے طاقت ناگزیر ہے تاکہ اسلامی صداقت کو غلبہ حاصل ہو سکے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ چونکہ مسلم دنیا میں حکمران غیر اسلامی قانونی ضابطے استعمال کرتے ہیں اس لیے وہ جدید جاہلیت کا حصہ ہیں اور اس لیے وہ سچے مسلمان نہیں ہیں۔ کفار کی طرح ان سے بھی لڑا اور طاقت سے ہٹایا جا سکتا ہے کیونکہ مسلمانوں کا بنیادی مقصد حیات زمین پر اللہ کی حکمرانی کا قیام ہے۔

قطب کی دلیل کا سب سے نامناسب اظہار محمد الفراج کی کتاب ''نظر انداز کردہ فریضہ'' (The Neglected Duty) میں ملتا ہے۔ فراج اسلامی جہاد کا ایک رکن تھا اور اس نے اس کتاب کو گروپ کے نظریے کی وضاحت اور دفاع کے لیے ایک طرح سے داخلی مباحث پر مبنی مقالے کے طور پر استعمال کیا۔ اس کتاب میں دیے گئے دلائل جہادی مباحث کے لیے خام مال بن چکے ہیں، اولاً فراج ابن تیمیہ کے حوالے سے ایمان میں جہاد کی مرکزیت پر دلائل دیتا ہے۔ وہ حدیث کے ساتھ ساتھ کئی حوالے دے کر یہ ثابت کرتا ہے کہ اسلام میں ''ایمان کے بعد جہاد کا مقام ہے''۔ اس سے وہ جہاد کا مرتبہ بڑھا کر اسے اسلام کا ایک رکن ثابت کرتا ہے یعنی یہ کہ ایک مسلمان ہونے کے لیے جہاد لازماً مطلوب ہے۔ فراج کی دلیل ہے کہ جہاد ایک گم شدہ فریضہ بن چکا ہے اور یہ ایسی ذمہ داری ہے جسے ایمان کے مرکزی رکن کی حیثیت سے دوبارہ زندہ کرنا چاہیے۔

ثانیاً، وہ قطب کی دلیل کو بار بار دہراتا ہے کہ جو حکمران اسلامی قوانین کا نفاذ نہیں کرتے وہ بے ایمان ہیں اس لیے انہیں اقتدار سے ہٹا دینا چاہیے۔ ان کی یہ دلیل قرآن کی ایک آیت کی بنیاد پر ہے جس کا القاعدہ والے کثرت سے حوالہ دیتے ہیں: ''جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی

لوگ کافر ہیں'' (القرآن ۵:۴۸)۔ یہ دلیل دینے میں فراج منگولوں (تاتاریوں) کے خلاف ابن تیمیہ کے فتوی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ جونہی انہوں نے مسلمانوں کے علاقوں کو فتح کیا وہ مسلمان ہو گئے۔ اس طرح یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا ان کے خلاف لڑنا ایک جائز جہاد تھا۔ ابن تیمیہ نے اس دلیل سے جواب دیا کہ جو کوئی اپنے مسلمان ہونے کا اعتراف کرے وہ اس وقت تک مؤمن نہیں ہے جب تک وہ شریعت کی اتباع میں ناکام رہتا ہے یا معاشرے اور مطلوبہ برتاؤ سے متعلق بڑے احکام کو توڑتا ہے۔ جوہنیز جانسن واضح کرتا ہے کہ ''احکامات کی وہ فہرست جسے وہ پیش کرتا ہے خاصی طویل ہے اور یہ بالکل واضح نہیں ہے کہ کتنے غیر نافذ احکامات حکمران (یا کسی مسلمان فرد) کو اس مقام تک لے جاتے ہیں کہ واپسی کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ وہ کس وقت مرتد بن جاتا ہے کہ اس کے ساتھ لڑنا جائز ہو؟'' جہادیوں کے نزدیک یہ منطق صاف ہے۔ منگولوں نے چنگیز خان کے یاسا (Yasa) قوانین کا نفاذ جاری رکھا اس لیے وہ مسلمان نہیں تھے۔ جہادی اس نقطۂ نظر کو معاصر ریاستوں کی حالت سے مشابہ سمجھتے ہیں جہاں حکمرانوں نے صرف شریعت کی بجائے مغربی قوانین اپنائے ہوئے ہیں۔

فراج اور دوسرے مصری جہادیوں پر قطب کا اثر بہت گہرا ہے۔ اس نے کئی انواع کے جہادی گروپوں میں ایک روح پھونک دی ہے۔ ان میں اسلامک لبریشن آرگنائزیشن، تکفیر والہجرۃ، جہنم سے نجات، جامعہ اسلامیہ اور اسلامک جہاد شامل ہیں۔ بین الاقوامی جہادی تحریک کے سرکردہ دو مصری مفکرین پر بھی اس کا بہت اثر تھا۔ پہلے عمر عبدالرحمٰن ہیں جو اسلامک جہاد اور جامعہ اسلامیہ کے سابق مفتی تھے۔ یہ ان دنوں امریکہ میں دہشت گردی کے ارتکاب کی سازش کی بنا پر عمر قید کی سزا کاٹ رہے ہیں*۔ الازہر یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں اور قطب کی تحریروں سے متاثرہ لوگوں کے لیے ایک رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک نابینا شخص تھے جو زبانی اپنے بیانات جاری کرتے تھے اس لیے ان کے نظریات سے متعلق تحریریں کم دستیاب ہیں۔ تاہم انہوں نے زمین پر اللہ کی لازمی حکمرانی اور مرتد حکمرانوں کو جہاد کے ذریعے اقتدار سے ہٹانے کے لیے قطب کے سخت موقف کی پورے جوش سے حمایت کی۔ رحمٰن کے مطابق ''اسلام کے خلاف کام میں سب سے پیش پیش دشمن امریکہ اور اس کے اتحادی ہیں''۔ کئی جہادیوں کے

* شیخ عمر عبدالرحمٰن قید سے رہائی کے بعد ایک اسرائیلی حملے میں جاں بحق ہو چکے ہیں۔

نزدیک عمر عبدالرحمٰن، عبداللہ عزام کا صحیح جانشین ہے، جو القاعدہ کے بانیوں میں سے ہے۔ وہ ۱۹۸۹ء میں عبداللہ عزام کے قتل کے بعد عالمی جہاد سے تعلق رکھنے والا ایک عالمی لیڈر ہے۔ اس کی اسیری نے یقیناً اس کے کردار کو گھٹا دیا ہے۔

قطب نے ڈرامائی طور پر القاعدہ کے نائب امیر (Second in Command) ایمن ظواہری پر بہت اثر چھوڑا۔ اپنی کتاب ''نبی کے جھنڈے تلے جانباز'' (Knights under the Prophet's Banner) میں ظواہری قطب کو ''بنیاد پرست تحریکوں کا بہت نمایاں نظریہ ساز'' کہتا ہے۔ ظواہری کے نزدیک قطب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ نظر آتا ہے کہ:

قطب کا ادعا یہ ہے کہ اسلام میں توحید کا مسئلہ بہت اہم ہے اور یہ کہ اسلام اور اس کے دشمنوں کے درمیان جنگ بنیادی طور پر مسئلۂ توحید پر ایک نظریاتی جنگ ہے۔ ان کے درمیان اس بات پر بھی جنگ ہے کہ اقتدار و اختیار کس کی ملکیت ہے: ''اللہ کے طریقے اور شریعت کی یا انسانوں کے وضع کردہ قوانین اور مادی اصولوں کی یا ان لوگوں کی جو خالق و مخلوق کے درمیان خود کے وسیلہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ---'' اس توثیق نے اسلامی تحریک کی بے حد مدد کی کہ وہ اپنے دشمنوں کے بارے میں جان لے اور ان کی نشاندہی کرے۔

خدا کی توحید سے وفاداری اور اس کے بلاشرکت غیرے اقتدار و اختیار کے اعتراف کے لیے قطب کی دعوت ایک چنگاری تھی جس نے اندرون اور بیرون ملک اسلام کے دشمنوں کے خلاف اسلامی انقلاب کو بھڑکا دیا۔ اس انقلاب کے خونی ابواب روز بروز کھلتے جا رہے ہیں۔

قطب کا دنیا کے بارے میں تصور اور ایک اسلامی ریاست کے قیام کی غیر متزلزل خواہش، چاہے اس کے لیے تشدد ہی کیوں نہ استعمال کرنا پڑے، نے ظواہری کے خیالات کی صورت گری کی ہے۔ زمین پر خدا کے اقتدار کی یہ دورخی جدوجہد کسی درمیانی بنیاد کو ختم کر ڈالتی ہیں اور نیکی اور بدی کے درمیان قرب قیامت والی ایک ہزار سالہ جنگ کے لیے راستہ ہموار کر دیتی ہے۔

دوسرے ممالک میں بھی جہادیوں نے قطب کے نظریات سے استفادہ کیا ہے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں مصر میں جمال عبدالناصر نے جب جہادیوں کے خلاف بڑے پیمانے پر کارروائی کی تو قطب کے کئی

شاگرد مصر سے سعودی عرب فرار ہو گئے۔ ان میں بعض نمایاں مفکرین نے یونیورسٹیوں میں پروفیسر کے عہدے حاصل کر لیے۔ سید قطب کا بھائی محمد شاید اس کی ایک بہتر مثال ہے۔ ۱۹۶۴ء میں اس نے ''بیسویں صدی کی جاہلیت'' نامی کتاب شائع کی جس نے سید قطب کے دلائل کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ (انتہاء پسند اس کی ایک پُر تاثیر کتاب ''اسلام: غلط سمجھا ہوا دین'' کا اکثر حوالہ دیتے ہیں)۔ محمد قطب نے یونیورسٹی میں نہ صرف اسامہ بن لادن کو پڑھایا بلکہ مستقبل کے بعض مختلف الرائے اسلام پسندوں بشمول سفر الحوالی کو بھی پڑھایا۔ سعودی حکومت نے قطب کے نظریات کی اشاعت کو برداشت کیا (شاید اس کی حمایت بھی کی) کیونکہ ایسا کرنا ناصر سے ان کے تنافر اور مصر سے ان کی خارجہ پالیسی سے مطابقت رکھتا تھا۔

اب تک بحث سے اگرچہ ایسا لگ رہا ہے کہ اسلامیت کو انتہاء پسند بنانے کا سارا الزام سید قطب کے سر جاتا ہے مگر سعودیوں نے اپنا جہادی فہم ابن وہاب کی فکر سے پروان چڑھایا ہے جواب بھی بہت اثر انداز ہے۔ سعودی جہادی قطب کو ایک اچھا مسلمان سمجھتے ہیں جس نے اچھے کام کیے لیکن وہ اس پر اتنا بھروسہ نہیں کرتے جتنا مصری گروپ کرتے ہیں بلکہ وہ ابن وہاب کے نظریات پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں جو کہ ابن تیمیہ تک ان کا براہ راست وسیلہ ہیں اگرچہ اس بات کے بھی شواہد ملتے ہیں کہ ابن تیمیہ کے ابن وہاب پر اثرات روایتی فکر کے مقابلے میں کم تھے۔

انتہاء پسندوں کی سب سے زیادہ پسندیدہ کتاب ابن وہاب کی ایک مختصر کتاب ''اسلام کو باطل کرنے والے دس امور'' ہے۔ یہ ایسے امور ہیں کہ ان کا مرتکب از خود دین سے خارج ہو جاتا ہے۔ ان میں تین امور جہادیوں کے لیے خصوصاً اہم ہیں۔ پہلا یہ کہ ایک مسلمان کافر بن جاتا ہے اگر وہ کسی کو اللہ کی عبادت میں شریک مانتا ہے۔ اپنی زندگی میں ابن وہاب بعض ایسے اعمال کے خلاف لڑتا رہا جنہیں وہ انحرافی شرک سمجھتا تھا مثلاً تصوف۔ توحید عبادت کے بارے میں ابن تیمیہ کی دلیل کو استعمال کرتے ہوئے جہادی کسی بھی ایسے حکمران کی مذمت کرتے ہیں جو غیر اسلامی قوانین کا نفاذ کرتا ہے۔

دوسرا، کوئی مسلمان جو اللہ کے نازل کردہ احکام کے برخلاف کسی اور قاعدے کی بناء پر فیصلہ کرتا ہے اور یہ ایمان رکھتا ہے کہ یہ قانون خدا کے قانون سے بہتر ہے وہ مرتد ہو جاتا ہے۔ غیر متشدد سلفیوں کے

نزدیک اس اصول کے دو حصے بہت اہم ہیں: مرتد ہوجانے کے لیے ایک حکمران نہ صرف غیر اسلامی قوانین کا نفاذ کرتا ہو بلکہ وہ یہ ایمان بھی رکھتا ہو کہ وہ اسلام سے بہتر قانونی طریقے استعمال کر رہا ہے۔ جب تک ایک لیڈر کھلم کھلا یہ اعلان نہ کرے کہ اس نے اسلام کو رد کر دیا ہے یا یہ کہ وہ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو افضل سمجھتا ہے (جس کا امکان نہایت کم ہے) وہ مسلمان رہتا ہے۔

دوسری جانب جہادی یہ دلیل دیتے ہیں کہ اثبات ارتداد کے لیے اعمال ہی بنیاد ہیں۔ انتہاء پسندوں کے نزدیک اسلام کی بعض چیزیں ایسی ہیں جو ''بدیہی'' ہیں مثلاً اسلام کو باطل کرنے والے دس امور۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر ایک لیڈر ان میں سے کسی ایک کی بھی خلاف ورزی کرتا ہے تو یہ اس کے ارتداد کا ثبوت ہے کیونکہ وہ عمداً خدا کی مرضی کا مذاق اڑاتا ہے۔ قطب اور مصری انتہاء پسندوں کی طرح سعودی جہادی بھی اس دلیل کو ابن تیمیہ کے توحید الٰہی کے تصورات میں پاتے ہیں۔ یعنی یہ خالق پر ایمان کے ساتھ ساتھ اس کی فرمانبرداری اور عبادت دونوں کا تقاضا کرتی ہے۔

تیسرا یہ کہ مسلمانوں کے خلاف کفار کی حمایت اور مدد بھی ارتداد ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ باقی تمام اسباب کے مقابلے میں یہ ایک مرکزی سبب بن گیا ہے جسے القاعدہ عالم اسلام میں حکومتوں پر ارتداد کا الزام لگانے کے لیے استعمال کرتی ہے۔ یہ تحریک اور اس کے معاونین قرآن کی اس آیت کا مسلسل حوالہ دیتے ہیں: ''اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو دوست اور محافظ نہ بناؤ؛ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست اور محافظ ہیں'' (قرآن ۵:۵۱)۔ یہ جاننا بہت اہم ہے کہ اس آیت میں گرائمر کی ایک اہم الجھن پائی جاتی ہے۔ اس میں ''ولی'' کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے جو قدیم عربی زبان میں سرپرست کے لیے استعمال کی جانے والی ایک اصطلاح ہے، اگرچہ دور حاضر میں اس کے مفہوم میں وسعت آ گئی ہے۔ غیر مسلموں کے ساتھ کسی بھی تعلق کو شامل کرنے کے لیے جہادی 'ولی' کی ایک بہت وسیع تعریف کرتے ہیں۔

جہادی بالخصوص سعودی حکومت کے اس فیصلے کا حوالہ دیتے ہیں جس میں ۱۹۹۰-۹۱ء میں اس نے امریکی فوجوں کو عراق پر حملہ کرنے کی اجازت دی تھی۔ اسے مسلمانوں کے خلاف جنگ میں کفار کو دوست اور حامی سمجھنے کے مترادف خیال کیا گیا (اگرچہ القاعدہ صدام حسین کو کبھی مسلمان نہیں سمجھے گی)۔ اسامہ بن

لادن اپنے ۱۹۹۶ء کے اعلان جنگ میں اس کا براہ راست حوالہ دیتا ہے: ''حکومت نے امت مسلمہ کے ساتھ غداری کی ہے اور مسلمانوں کے خلاف اس نے مدد اور تعاون کر کے خود کو کفار میں شامل کر لیا ہے۔ یہ ایک مشہور بات ہے کہ یہ عمل اسلام کو باطل کر دینے والے دس امور میں سے ایک ہے''۔

''مدد کرنا'' اور ''حمایت کرنا'' بنیادی طور پر موضوعاتی اصطلاحات ہیں۔ القاعدہ ان کا استعمال ایک وسیع مفہوم پیدا کرنے کے لیے کرتی ہے جس سے ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' میں امریکہ کے ساتھ کسی بھی قسم کا تعاون ان میں شامل ہو جائے۔ حتیٰ کہ ان کے لیے حمایت کا لفظ استعمال کرنا بھی ارتداد قرار دیا جاتا ہے۔ بن لادن کی ایک ٹیپ سے اس کے مندرجہ ذیل بیان کو لے لیجیے جو فروری ۲۰۰۳ء میں منظر عام پر آئی تھی جس وقت امریکہ عراق پر حملہ کرنے کے لیے پوزیشن سنبھال رہا تھا:

''ہم یہ بھی واضح کر دیتے ہیں کہ جس کسی نے بھی امریکہ کی حمایت کی بشمول عراقی منافقوں یا عرب ممالک کے حکمرانوں کے، وہ سب جنہوں نے ان کے اعمال کی منظوری دی اور ان کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر صلیبی جنگ لڑنے میں ان کی پیروی کی یا انہیں ہوائی اڈے اور انتظامی تعاون پیش کیا، یا کسی بھی قسم کا تعاون کیا حتیٰ کہ عراق میں مسلمانوں کو قتل کرنے کے لیے الفاظ کا تعاون کیا انہیں جان لینا چاہیے کہ وہ مرتد ہیں۔ ان کا خون بہانا اور ان کی جائیداد لوٹ لینا جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا دوست اور محافظ مت بناؤ؛ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست اور محافظ ہیں''۔

اگرچہ اس کی تصدیق کرنا مشکل ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ سعودی سلفیوں کو ابن وہاب کے علاوہ تین مزید ذرائع یا مصادر نے انتہاء پسند بنایا ہے۔ اولاً سعودی سلفیوں میں انتہاء پسند عناصر شروع سے موجود رہے ہیں جنہیں گیڈو سٹینبرگ (Guido Steinberg) وہابیہ کا انتہاء پسند ونگ کہتا ہے۔ یہ عناصر ۱۹۲۰ء سے موجود رہے ہیں اور ۱۹۲۸-۲۹ء میں اخوان کے انقلاب میں ان کے ساتھ شامل تھے۔ دوسرا یہ ہے کہ اسلام پسندوں کے خلاف ناصر کے سخت اقدام کے بعد سعودی عرب میں پڑھانے والے مصریوں کی تدریس اور سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ قطب کا اثر اس کی کتب کے ذریعے محسوس کیا گیا۔ تیسرا یہ ہے کہ افغانستان میں روس کے خلاف جنگ کے نتیجے میں انتہا پسندی تیزی سے پھیلی۔ اس کشمکش نے مصریوں،

سعودیوں اور دوسرے ملکوں کے باشندوں کو کشمکش کے ایک ایسے علاقے میں جمع کر دیا جہاں انہوں نے تشدد کے سیاق میں اسلام کا منفرد مطالعہ کیا۔ اس دور میں مزید انتہاء پسند عناصر کا اثر پاکستان میں دیوبندی نظامِ مدرسہ سے آتا ہوا بھی محسوس کیا گیا۔ اس صورت حال نے مصر وغیرہ ممالک سے آئے ہوئے جہادی عناصر کو تشہیر کا بہت بڑا موقع فراہم کیا جس نے سعودی جنگجوؤں کے نظریات کو وسیع پیمانے پر پھیلایا۔ اس تجربے سے پہلے سعودی سلفی عموماً حکومت کے معاون تھے کیونکہ حکومت سلفیت کی حمایت کرتی تھی اور ملک کی خارجہ پالیسی کے ایک جزء کے طور پر اسے برآمد بھی کرتی تھی۔ یہ حمایت بالخصوص سعودی عرب میں امریکی فوجوں کے اڈے قائم ہو جانے کے فوراً بعد افغانستان میں بہت ہی کمزور ہوگئی ۔

عالمی جہاد (Global Jihad)

اسلام میں خارجی جہاد کی دو قسمیں ہیں: اقدامی اور دفاعی۔ اسلامی اصول فقہ میں اقدامی جہاد اسلام کی ترویج اور ترقی، روشن خیالی اور دارالحرب میں بہتری لانے کے لیے عمل میں لایا جاتا ہے۔ دورِ حاضر کی اکثر تشریحات کے مطابق اقدامی جہاد صرف خلیفۂ وقت کی زیر قیادت ہی شروع کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی ریاست اور غیر مسلم حکومتوں کے درمیان عارضی صلح اور مختلف متناسب معاہدات مثلاً مسلم اقلیتوں کو عبادت کی آزادی کا معاہدہ وغیرہ کو ایسے اقدامی جہاد کے کسی اعلان میں پوری طرح مدنظر رکھا جاتا ہے (جس سے یہ اعلان بعض شرائط کا پابند ہو جاتا ہے)۔ آج بہت کم اسلام پسند جہاد کی اس قسم پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔

تاہم دفاعی جہاد وسیع پیمانے پر قبول کیا ہوا تصور ہے جو ذاتی دفاع کے بین الاقوامی اصولوں اور یہودی عیسائی نظریہ جنگ برائے انصاف کے مشابہ ہے۔ اکثر مسلمان علماء کے مطابق جب ایک خارجی طاقت مسلمانوں کے علاقے پر حملہ کرتی ہے تو تمام مسلمانوں پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ایمان اور ایمانداروں کے تحفظ کے لیے جہاد کا آغاز کر دیں۔ عالمی سطح پر مسلمان قوم کی بقا کو یقینی بنانے کے لیے باہمی تحفظ کو ایک دینی فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ دفاعی جہاد کی اصل اساس انصاف پسندی پر دینی زور دیا جانا ہے جس کا ذکر قرآن (۶:۱۵۱) میں ہے: ''جس جان کی اللہ نے حرمت رکھی اسے ناحق نہ مارو''۔ خارجی جارحیت کے

خلاف مسلمان قوم کے دفاع کو انتہائی عادلانہ اور ضروری سمجھا جاتا ہے۔

اگرچہ تقریباً تمام مسلمان علماء کا اس بات پر مکمل اتفاق ہے کہ دفاعی جہاد مسلمانوں پر فرض ہے تاہم یہ قضیہ ۱۹۷۹ء میں روس کے افغانستان پر حملہ کرنے تک نسبتاً خوابیدہ رہا۔ اس وقت علماء کی اکثریت نے اس دلیل کو قبول کیا تھا کہ جہاد کو صرف روح اور باطن کے تزکیے کی جدوجہد تک محدود رہنا چاہیے۔ اسے جہاد اکبر کہا جاتا ہے۔ جہادیوں کے نزدیک اس تصور کو چیلنج کرنا اور افغانستان میں مسلمان بھائیوں اور بہنوں کی خاطر روس کے خلاف جنگ میں شرکت کی ترغیب دینا ایک نہایت اہم مقصد تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس وقت کی اکثر تحریریں جہاد کی ترغیب پر مشتمل تھیں جن میں اس کی فضیلت بیان ہوتی تھی۔

اس دلیل کے استعمال کے وقت جہادی ابن تیمیہ پر بہت بھروسہ کرتے ہیں۔ نظریۂ جہاد کے سلسلے میں ابن تیمیہ کا کردار زیادہ تر دینی اور اخلاقی قدروں سے متعلق ہے نہ کہ قانونی امور سے جو عادلانہ جنگ یا جنگ میں مشغول ہونے کے اصولوں کے بارے میں ہوتے ہیں۔ اپنی تحریروں میں اس نے دلیل دی کہ ''جہاد میں حصہ لینے کا حکم اور اس کے فضائل کا تذکرہ قرآن وسنت میں بے شمار جگہوں پر ہوا ہے۔ اس لیے یہ بہترین رضا کارانہ دینی عمل ہے جسے ایک شخص ادا کرسکتا ہے۔ تمام علماء متفق ہیں کہ یہ حج، عمرہ، نفلی نماز اور نفلی روزوں سے بہتر ہے جیسا کہ قرآن اور سنت سے واضح ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: معاملات کا سر اسلام ہے، اس کا درمیانی ستون نماز ہے اور اس کی چوٹی جہاد ہے۔ آپ نے مزید فرمایا ہے: جنت کے ایک سو درجات ہیں جن کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا زمین وآسمان کے درمیان ہے۔ اللہ نے یہ سب ان لوگوں کے لیے تیار کیے ہیں جو جہاد میں شرکت کرتے ہیں''۔

جہادیوں نے ابن نحاس الدِمیاتی (م ۱۴۱۲ء) کی کتب سے بھی بہت کچھ اخذ کیا۔ اپنی کتاب ''اللہ کی راہ میں جہاد سے پرہیز کرنے والوں کے لیے نصیحت'' (*Advice to Those Who Abstain from Fighting in the Way of Allah*) میں ابن نحاس نے باقاعدہ طریقے سے ان لوگوں کے تحفظات اور خدشات پر بحث کی ہے جو جہاد میں شرکت سے کتراتے ہیں۔ اس سلسلے میں اس نے موت کا خوف، بچوں، بیویوں، رشتہ داروں، دوستوں، سماجی مرتبہ اور نسل کے متعلق اندیشے؛ مادی اشیاء کی محبت، جنگ میں شرکت سے پہلے خود کو مضبوط بنانے کی خواہش وغیرہ کو اپنی بحث کا موضوع بنایا ہے۔ ان

سب کے بارے میں ابن نحاس قرآن اور سنت رسول سے حوالے نقل کرتا ہے اور اس بات کی دلیل دیتا ہے کہ اس زندگی کی کوئی اہمیت نہیں اگر اس کا اخروی زندگی سے موازنہ کیا جائے۔

عصر حاضر میں دفاعی جہاد میں فعال شرکت کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے عبداللہ عزام ایک بہت اہم شخصیت ہے۔ ابن تیمیہ اور ابن نحاس کی روایت کی پیروی کرتے ہوئے اس کی بعض تحریریں جہاد میں شرکت کی روح پیدا کرنے کی نیت سے لکھی گئیں۔ اپنی کتاب ''قافلے میں شامل ہو جایئے'' (Join the Carvan) کی ابتداء اس دلیل سے کرتا ہے کہ ''جو شخص بھی آج مسلمانوں کی حالت پر غور کرے گا تو اسے معلوم ہوگا کہ ان کی بدقسمتی کی سب سے بڑی وجہ دنیا کی محبت اور موت کے خوف سے جہاد کو ترک کر دینا ہے۔ اپنی بات کی تائید میں عبداللہ عزام ان قرآنی آیات کے حوالے دیتا ہے جنہیں آج القاعدہ والے اکثر پیش کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً ''تم پر فرض ہوا اللہ کی راہ میں لڑنا اور وہ تمہیں ناگوار ہے، اور قریب ہے کہ کوئی بات تمہیں بُری لگے اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔ اور قریب ہے کہ کوئی بات تمہیں پسند آئے اور وہ تمہارے حق میں بُری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے'' (قرآن ۲:۲۱۶)۔

وہ یہ واضح کرنے کے لیے ایک قانونی دلیل بھی دیتا ہے کہ جہاد ایک ناقابل انکار فریضہ ہے۔ عزام ابن تیمیہ کی اسلام میں فرض عین اور فرض کفایہ والی تمیز کو استعمال کرتا ہے۔ فرض کفایہ وہ ہے جسے مسلمانوں کا ایک گروہ تمام مسلمانوں کی طرف سے ادا کر سکتا ہے جبکہ فرض عین وہ ہے جو گناہ سے بچنے کے لیے ہر ایک مسلمان کو لازماً ادا کرنا ہوتا ہے۔ جہاد کے تناظر میں ابن تیمیہ نے یہ دلیل دی کہ ''جہاد فرض ہے چاہے اسے اپنی طرف سے شروع کیا جائے چاہے اسے دفاع کی صورت میں شروع کیا جائے۔ اگر ہم اقدامی صورت کو لیں تو یہ ایک فرض کفایہ ہے یعنی اگر مسلمانوں کے کسی گروہ نے اسے شروع کیا تو سارے مسلمانوں کی طرف سے ادا سمجھا جائے گا اور اس کی فضیلت انہیں حاصل ہوگی جنہوں نے اسے کیا--- لیکن اگر دشمن مسلمانوں پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو اس صورت میں اسے دفع کرنا ان تمام لوگوں پر فرض عین ہے جن پر حملہ ہوا ہے اور دوسرے مسلمانوں پر اپنے بھائیوں کی مدد کرنا فرض ہے''۔

عزام نے ابن تیمیہ کے انداز استدلال کو اختیار کیا اور کہا کہ اگر مسلمانوں کا ایک گروہ جو دشمن کو دفع کرنے کے لیے اپنی پوری کوشش کر رہا ہے اکیلے ناکام ہو جاتا ہے تو جہاد قریب کے علاقے کے مسلمانوں

پر فرض عین ہو جاتا ہے:

''ایک حنفی فقیہ ابن عابدین فرماتے ہیں: ''جہاد قریبی علاقے کے مسلمانوں پر اس صورت میں فرض عین بن جاتا ہے جب دشمن کسی اسلامی علاقے پر یلغار کرے--- البتہ یہ دور کے علاقے میں بسنے والے مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے جب تک ان کی ضرورت نہ پڑے۔ یہ ضرورت اس صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب مسلمانوں کا پہلا گروہ دشمن کے مقابلے میں ناکام ہو جائے۔ یہ اس صورت میں بھی ہے کہ اگر وہ پہلا گروہ ناکام تو نہیں ہوا لیکن وہ غافل ہے اور جہاد کی ادائیگی میں ناکام ہو جاتا ہے۔ ان تمام صورتوں میں جہاد اردگرد کے مسلمانوں پر نماز اور روزے کی طرح فرض عین بن جاتا ہے۔ انہیں اسے ترک نہیں کرنا چاہیے۔ جن لوگوں پر جہاد فرض ہے ان کا دائرہ اتنا وسیع ہو سکتا ہے کہ یہ مشرق اور مغرب کے تمام اہل اسلام پر فرض ہو جاتا ہے''۔

عزام کے مطابق اکیلے افغان دوسرے مسلمانوں کی مدد کے بغیر اس فریضے کو ادا نہیں کر سکتے تھے:

''جہاد کے لیے انسانوں کی ضرورت ہے اور افغانستان کے باشندے اس جہاد کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتے تھے یعنی دشمن کفار کو افغانستان سے نکال نہیں سکتے تھے اس صورت میں یہ ملّی فریضہ بن گیا ہے۔ اور افغانستان میں یہ فرض عین ہے اور یہ اس وقت تک رہے گا جب تک کمیونسٹوں کو بھگانے کے لیے کافی مجاہدین جمع نہیں ہو جاتے۔ اس کے بعد یہ دوبارہ فرض کفایہ بن جائے گا''۔

عزام یہ دلیل بھی دیتا ہے کہ یہ ایک ابدی فریضہ ہے۔ اپنے اس دعویٰ میں وہ واضح طور پر سید قطب سے متاثر نظر آتا ہے اور قطب کی تحریر کا درج ذیل حصہ نقل کرتا ہے:

''امت مسلمہ کی زندگی میں اگر جہاد ایک عارضی امر ہوتا تو قرآنی عبارات کے یہ حصے اس قسم کی آیات سے بھرے ہوئے نہ ہوتے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بھی اس قسم کے مواد سے معمور نہ ہوتیں--- اگر جہاد اسلام کا ایک وقتی معاملہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک آنے والے ہر مسلمان کو درج ذیل الفاظ نہ فرماتے: جو شخص نہ تو دوران جہاد میں اور نہ ہی جہاد کی تمنا کے ساتھ فوت ہو جاتا ہے وہ ایک قسم کی منافقت کے ساتھ فوت ہوتا ہے''۔

اس طرح عزام یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ افغانستان میں جہاد ایک دائمی فرض عین ہے۔ ان حالات

میں جہاد کا مرتبہ اسلام کے ارکان خمسہ کے برابر ہو جاتا ہے جو ہر مسلمان کے لیے لازمی ہیں۔ بعد میں القاعدہ کی طرح عزام دفاعی جہاد کے بحیثیت ایک دینی فریضہ کی اہمیت پر زور دینے کے لیے ابن تیمیہ کی ایک تحریر کا استعمال کرتا ہے: ''جہاں تک قابض دشمن کا تعلق ہے جو دین اور دنیا کو تباہ کر رہا ہے تو ایمان کے بعد کوئی شے دفاع سے زیادہ لازمی نہیں ہے''۔ اس اساس پر عزام یہ دلیل دیتا ہے کہ ''جہاد نہ کرنے والا ہر شخص آج ایک اہم فریضے کا تارک ہے جس طرح کوئی رمضان کے دنوں میں کسی عذر کے بغیر کھاتا پیتا ہو، یا وہ اس مالدار صاحب نصاب کی طرح ہے جو اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا''۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ''جہاد آج اس زمین کے آخری ٹکڑے کی بازیابی تک فرض عین ہے جو کبھی مسلمانوں کی تھی لیکن آج وہ کفار کے قبضے میں ہے''۔ مثلاً (سپین)۔ یہاں اس دلیل نے وہ شکل اختیار کر لی ہے جسے اولیور رائے نے ''خانہ بدوش جہاد'' کا نام دیا ہے یعنی کفار کے مقابلے میں مسلمانوں کے دفاع کی دائمی جدوجہد۔

القاعدہ کی حالیہ فکر پر اس کا اثر اٹل ہے۔ یہ کوئی حیران کن بات نہیں ہے کہ عزام نے القاعدہ کی بنیاد رکھنے میں مدد کی اور اپریل ۱۹۸۸ء میں ''الجہاد'' نامی مجلّے میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون ''ٹھوس بنیاد'' (القاعدہ البُلبا) میں اس نے اس تحریک کی اساس سے متعلق توجیہات پیش کیں۔ امریکہ کے خلاف حملوں کے جواز کے لیے القاعدہ کے کئی بیانات خانہ بدوشانہ جہاد کے فریضے سے متعلق عزام کی دلیل کی شرحیں ہیں۔ تاہم دلیل کے اطلاق کے لیے جہادیوں کو یہ واضح کرنا پڑتا ہے کہ امریکی مسلمانوں کے علاقوں پر قابض ہو رہے ہیں۔ بن لادن کے نزدیک یہ توجیہہ ۱۹۹۰ء میں صاف ظاہر ہو گئی جب شاہ فہد نے صدام کو پیچھے دھکیلنے کے لیے افغان جنگ کے آزمودہ جنگجوؤں کو استعمال کرنے کی بجائے سعودی عرب میں امریکی فوجوں کو آنے کی اجازت دے دی۔ ۱۹۹۸ء میں جاری کردہ ایک فتویٰ میں بن لادن اور کئی دوسرے جہادیوں نے یہ دلیل دی کہ ''سات سالوں سے امریکہ اسلام کے مقدس ترین مقامات پر قبضہ کر رہا ہے، جزیرۂ عرب اور اس کی دولت لوٹ رہا ہے، اس کے حکمرانوں پر حکم چلا رہا ہے، اس کے لوگوں کی بے عزتی کر رہا ہے، اس کے ہمسایوں پر دہشت پھیلا رہا ہے اور جزیرہ میں اپنے اڈے اس انداز سے بنا رہا ہے جس سے وہ ہمسایہ مسلمان ملکوں سے لڑنے کی بہتر پوزیشن میں ہو جائے گا۔ اگر کچھ لوگوں نے پہلے قبضہ کی حقیقت کے موضوع پر اختلافی مباحثے کیے تھے تو آج جزیرہ کے تمام لوگ اس سچ کو تسلیم کر

چکے ہیں۔

اس دلیل سے جہادیوں کو کم انتہاء پسند گروہوں مثلاً سفر الحوالی اور سلمان العودہ سے حمایت مل گئی جو امریکی موجودگی کے مخالف تھے۔ مثلاً اپنے ۱۹۹۶ء کے اعلان جنگ میں بن لادن نے حوالی کا واضح حوالہ دیتے ہوئے کہا: ''قیدی شیخ سفر الحوالی کو اللہ رہائی نصیب کرے انہوں نے ستر صفحات کی ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ جزیرۂ عرب میں امریکی موجودگی غاصبانہ فوجی قبضے کے پہلے سے تیار شدہ منصوبہ کے مطابق ہے''۔

بن لادن اور القاعدہ کو اپنے مخالف اسلام پسندوں سے بھی معاونت ملی جنہوں نے جولائی ۱۹۹۲ء میں ''یادداشت نصیحت'' (Memorandum of Advice) پر دستخط کیے تھے۔ اس یادداشت نے سعودی حکومت کی داخلہ اور خارجہ پالیسیوں پر عوامی تنقید کی بے مثال نمائندگی کی۔ اگرچہ ان میں سے بہت سے مخالف مذہبی قائدین القاعدہ کے حربوں اور تشدد کی حمایت نہیں کرتے پھر بھی حکومت پر ان کی تنقید اور سلطنت میں امریکی موجودگی کی مجموعی مخالفت نے بن لادن کو ایک ایسی سیڑھی مہیا کر دی جس سے اس نے امریکہ کو ایک غیر اسلامی حکومت کی حمایت یافتہ ایک قابض قوت ثابت کر دیا اور اس سے اسے اپنے دفاعی جہاد کا جواز بھی مل گیا۔

القاعدہ نے اپنے تمام اقدامات کی دفاعی نوعیت کو واضح کرتے ہوئے اس جہاد کو جائز قرار دیا۔ ۱۹۹۸ء میں دیے گئے ایک انٹرویو میں بن لادن نے یہ دلیل دی کہ ''ہم نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن جاری رکھا ہوا ہے۔ یہ مشن اللہ کے حکم کی تبلیغ ہے نہ کہ لوگوں کی قتل و غارت گری۔ ہم بذات خود قتل، تباہی، اور خباثت کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ ہم تو صرف اپنا دفاع کر رہے ہیں۔ یہ ایک دفاعی جہاد ہے۔ ہم اپنے لوگوں اور علاقوں کا دفاع کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے ہم کہتے ہیں کہ اگر ہمیں تحفظ نہ ملا تو امریکیوں کو بھی تحفظ نصیب نہیں ہوگا۔ یہ ایک اتنی واضح بات ہے جسے ایک امریکی بچہ بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ خود بھی زندہ رہو اور ہمیں بھی زندہ رہنے دو''۔

اکثر جہادیوں کے نزدیک یہ دفاعی دلیل گیارہ ستمبر کے واقعے کو بالخصوص جائز قرار دینے کے لیے انتہائی ضروری تھی۔ مثلاً گیارہ ستمبر کے حملوں کے فوراً بعد لندن میں القاعدہ کے ایک انتہاء پسند حامی ابوحمزہ

مصری نے یہ دلیل دی کہ ''یہ اپنے ذاتی دفاع کے لیے کیا گیا ہے۔ اگر انہوں نے یہ حملہ اس بناء پر کیا ہے تو انہوں نے جائز کیا ہے''۔ اس نے مزید کہا ''اگر آپ یہ سوال کریں کہ امریکہ میں یہ حملہ ذاتی دفاع کیسے ہے تو یہ ویسے ہی ہے جیسے ہیروشیما میں ذاتی دفاع کے طور پر (حملہ) کیا گیا تھا''۔

عوام کا قتل عام

قرآن اور پیغمبر محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] کی سنت میں عوام الناس کو قتل کرنے کے خلاف بھرپور تاکید کی گئی ہے۔ غیر متشدد سلفی اور دوسرے مسلمان بار بار درج ذیل دینی نصوص کا حوالہ یہ دلیل دینے کے لیے دیتے ہیں کہ لڑائی میں شریک نہ ہونے والوں کو نشانہ بنانا ممنوع ہے:

''اسی وجہ سے بنی اسرائیل پر ہم نے یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی'' (القرآن ۵:۳۲)۔

''اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا'' (القرآن ۲:۱۹۰)۔

''اللہ کے نام پر اور اللہ کے لیے جہاد کرو۔ قریب المرگ بوڑھوں، عورتوں، بچوں، اور ننھے معصوموں پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ غنیمت سے کچھ مت چراؤ اور وہ سب کچھ جمع کرو جو جنگ کے دوران تمہارا نصیب ہو اور اچھے کام کرو کیونکہ اللہ نیکوکاروں اور متقیوں سے محبت کرتا ہے'' (الحدیث)۔

''رُکو اے لوگو! تاکہ میں تمہیں میدان جنگ میں رہنمائی کے لیے دس اصول دے دوں۔ نہ سازش کرو اور نہ سیدھے راستے سے ہٹو۔ لاشوں کا مثلہ مت کرو۔ کسی بچے، عورت یا عمر رسیدہ کو قتل نہ کرو۔ درختوں کو نقصان پہنچاؤ اور نہ انہیں جلاؤ بالخصوص وہ درخت جو پھلدار ہیں۔ دشمن کے کسی ریوڑ کو ذبح مت کرو مگر یہ کہ اپنی خوراک کے لیے ہو۔ تم ان لوگوں کے قریب سے گزرو گے جنہوں نے اپنی زندگی راہبانہ خدمات کے لیے وقف کر رکھی ہے، ان سے کوئی تعرض نہ کرو''۔ (شام میں بازنطینی سلطنت کے خلاف جنگ کے لیے مسلمان فوج کو دی گئی خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر کی ہدایات)

اگرچہ غیر متشدد سلفی اس قسم کی دینی شہادت کو عوام کو قصداً نشانہ بنانے کے خلاف ایک ممانعت سمجھتے ہیں پھر بھی وہ جنگ کے دوران عام آبادی کی اموات کے امکان کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک جائز جہاد میں یہ قابل قبول نتائج میں سے ہے۔ غیر جنگجو اشخاص کی اموات کو محدود رکھنے کے لیے مسلمان فوجیوں کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا ضروری ہے لیکن باہمی نقصان اکثر ناگزیر ہوتا ہے۔ یہ صورت حال بالخصوص وہاں ہوتی ہے جہاں دشمن انسانوں کو ڈھال کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ ان حالات میں مسلمان فوجیوں کو حملہ کرنے کی اجازت ہے اور غیر لڑاکا لوگوں کی اموات کی ذمہ داری دشمن پر عائد ہوتی ہے۔

اس تناظر میں صرف جنگجوؤں کو حملے کا نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ جس میں نہ صرف فوجی، جنگ کی ابتدا کے ذمہ دار سیاسی قائدین اور خفیہ ایجنسیوں کے افسران شامل ہیں بلکہ ملٹری اور سیاسی ساخت سے باہر کا معاون عملہ مثلاً مشیران جو جنگ کی منصوبہ بندی میں مدد کرتے ہیں بھی شامل ہیں۔ اگرچہ وہ براہِ راست اصل جنگ اور لڑائی میں شامل نہیں ہوسکتے مگر معاون عملہ جنگی جدوجہد کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے وہ حملوں کا جائز نشانہ بنائے جاسکتے ہیں۔

عوام کو نشانہ بنانے کی جانب میلان ایک جدید سوچ لگتی ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ سید قطب اور نہ ہی ابن وہاب نے یہ دلیل دی ہے کہ جنگ اور لڑائی کے دوران عام شہریوں کو نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ ۱۹۹۰ء تک اس موضوع سے متعلق کوئی بحث نہیں ملتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ القاعدہ براہِ راست نبی [صلی اللہ علیہ وسلم]، ابتدائے اسلام اور قرون وسطیٰ کے علماء مثلاً ابن تیمیہ، ابن کثیر، ابن قیم، شوکانی، ابن القاسم اور ابن قدامہ کے نمونہ تک واپس پہنچ گئی ہے۔ قرآن وسنت سے وسیع دینی شواہد کی موجودگی میں جو کہ زندگی کے تقدس اور غیر لڑاکا لوگوں کے خلاف حملوں کو محدود رکھنے پر زور دیتے ہیں، القاعدہ غیر لڑاکا لوگوں کے خلاف کارروائی کے جواز پر کوئی دلیل نہیں دے سکی۔ لیکن گزشتہ عشرے یا تقریباً اتنی مدت کے دوران جنگ میں جائز اہداف کے بارے میں وسیع فہم کو ترقی دینے کے لیے اس نے نیا اجتہاد کیا ہے۔

عام شہریوں کو نشانہ بنانے کے بارے میں جہادی بحث ۱۹۹۰ء کے وسط سے الجیریا کی سول وار کے جواب میں شروع ہوئی جو اس وقت شروع ہوئی جب حکومت نے منتخب پارلیمنٹ کو ۱۹۹۲ء میں منسوخ کر دیا کیونکہ اس وقت یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ اسلامک سالویشن فرنٹ نئی حکومت پر غالب آ جائے گی۔ اس

تنازع کے بعد اسلام پسند باغیوں نے اپنے حملے حکومتی اہل کاروں، فوجی آفیسران اور پولیس تک محدود رکھے۔ تاہم اس کشمکش کا دائرہ اور مدت ۱۹۹۳ء میں مسلح اسلامی گروپ (GIA) کے وجود میں آنے سے بڑے عجیب انداز میں بڑھ گئے۔ شروع میں جی آئی اے نے سکیورٹی سروسز کے خلاف وسیع حملے شروع کیے اور کئی جونیئر وزراء اور قومی مشاورتی کونسل (جسے صدر محمد بوضیف نے اس تنازع کے بعد جمہوریت کے فروغ کے لیے تشکیل دیا تھا) کے اراکین کو قتل کیا۔

اس عرصہ کے دوران کچھ شواہد ملتے ہیں کہ بن لادن اور القاعدہ نے قمرالدین خربان جو الجیریا کے افغانوں کے لیڈر تھے کے ذریعے جی آئی اے کو محدود مدد فراہم کی تھی۔ الجیریا کے افغانوں سے مراد وہ الجیرین ہیں جو روس کے خلاف افغانستان میں لڑتے رہے۔ اس مدد میں مالی امداد بھی شامل تھی۔ القاعدہ نے اپنے جنگجو الجیریا میں بھیجے۔ اور دینی حوالے سے ابوقتادہ جیسے علماء فراہم کیے گئے۔ جس نے جی آئی اے کے مجلّہ ''الانصار'' کو شائع کرنے اور تقسیم کرنے میں بھی مدد دی۔ اس مجلّے کا تعلق لندن میں ابو مصعب سے ہے۔

جب عنتر زوابری جی آئی اے کا نیا امیر بنا تو یہ بڑھتے ہوئے تعلقات ۱۹۹۶ء میں بڑے ڈرامائی انداز میں بدل گئے۔ اس نے اپنے نئے عہدے کا آغاز ایک فتویٰ جاری کر کے کیا۔ جس میں اس نے سارے معاشرے پر ارتداد کا الزام لگایا اور الجیریا کے ان لوگوں کے خلاف حملے جائز قرار دیے جنہوں نے جی آئی اے میں شمولیت یا مدد سے انکار کیا۔ اس میں دوسرے مسلح اسلامی گروپ شامل تھے۔ اس انداز سے زوابری نے قطب کے دنیا کے بارے میں نظریہ کو شدت سے اختیار کیا: ''تم یا تو جی آئی اے کے ساتھ ہو اور اس طرح اسلامی صداقت کے ساتھ یا اس کے خلاف اور اس طرح اللہ کے خلاف۔ اس موقف کو جی آئی اے کی جانب سے ۱۹۹۷ء میں جاری کردہ ایک پوسٹر میں شائع کیا گیا: ہماری طرف سے شروع کی جانے والی اس جنگ میں غیر جانبداری کوئی چیز نہیں ہے۔ سوائے ان کے جو ہمارے ساتھ ہیں تمام لوگ مرتد ہیں اور موت کے مستحق۔

اس فتویٰ نے جی آئی اے کے آپریشنز کو ریاست سے ہٹا کر معاشرے میں ہلکے اہداف کی طرف کر دیا پھر انجام کار وسیع پیمانے پر عام شہریوں کے قتل و غارت تک پہنچا دیا۔ ۱۹۹۲ء میں عام شہریوں کی شرح

اموات صرف ۱۰ فیصد تھی جبکہ ۱۹۹۷ء میں یہ عدد ۸۴ فیصد تک پہنچ گیا۔ ہزاروں قتل ہو گئے۔ عام شہریوں کو یا تو معذور بنا دیا گیا یا سر تن سے جدا کر دیا گیا یا انہیں زندہ جلا دیا گیا۔ جی آئی اے کے سردار ابوالمضیر کے مطابق یہ سب لوگ ''اپنے سب سے چھوٹے بچے سے لے کر سب سے بڑی عمر کے شخص تک ہمارے جنگجوؤں کے دشمن بن گئے تھے''۔ اگرچہ چند ایک حملوں میں حکومت کی ممکنہ پیچیدگی کے کچھ شواہد ہو سکتے ہیں لیکن جی آئی اے نے ان میں سے اکثر کی ذمہ داری قبول کی تھی۔

اس قتل و غارت کے جواز نے بعد میں القاعدہ کے لیے گیارہ ستمبر کے حملوں اور عام شہریوں کو قصداً نشانہ بنانے کا بھی جواز فراہم کر دیا: وہ افراد جو حکومت کی حمایت کرتے ہیں وہ دشمن کے نائب اور نمائندے کے طور پر کام کرتے ہیں۔ اس لیے وہ جائز اہداف ہیں۔ صحافیوں اور رپورٹروں پر حملے کرنے کی جی آئی اے کی توجیہہ ملاحظہ کیجیے:

فرسودہ مرتد حکومت اپنے جرائم کو چھپانے اور اپنی زیادتیوں کو جائز قرار دینے کے لیے کرائے کے میڈیا کو استعمال کرتے ہوئے رکی نہیں۔ اس نے میڈیا کو تمام تحریری، دکھائے اور سنائے جانے والے جھوٹے بیانات اور افواہوں کو پھیلانے کے لیے ظلم و زیادتی کا ہتھیار بنا کر رکھ دیا ہے۔ ان مصنفین کا فریضہ بنتا تھا کہ وہ ان مشکل حالات میں اپنی قوم کے ساتھ کھڑے ہوتے اور جہاد مبارک کو گلے لگاتے لیکن اس کی بجائے انہوں نے مرتدین اور غداروں کی گھٹیا جانوں کے دفاع کے لیے اپنے قلموں کو تلواریں بنا لیا ہے۔ اس بناء پر مجاہدین ریڈیو اور ٹی وی کے لیے کام کرنے والے ہر خبر رساں اور صحافی کو حکومتی مرتدین سے مختلف نہیں سمجھتے۔ جی آئی اے ہر کام کرنے والے ہر رپورٹر کو دعوت دیتی ہے کہ وہ فوراً کام سے رک جائے۔ ورنہ یہ گروپ ان تمام کو نشانہ بنانا جاری رکھے گا جو اس دعوت پر عمل نہیں کریں گے۔ جو ہمارے ساتھ قلم کے ذریعے لڑے گا اس کے ساتھ تلوار کے ساتھ لڑا جائے گا۔

دوسرے لفظوں میں ''عام'' صحافی اور مدیران غیر جنگجو نہیں رہے کیونکہ وہ حکومت کے مفاد کے لیے خدمات سرانجام دیتے ہیں۔

اسی قسم کا استدلال اساتذہ اور سکول کے بچوں پر حملے کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ کیونکہ وہ

حکومت کے زیر کنٹرول سکولوں میں حاضر ہو کر حکومت کی حمایت کرتے تھے۔ عربی روزنامہ ''الحیاۃ'' میں شائع ہونے والے ایک بیان میں جی آئی اے نے ان لوگوں کو متنبہ کیا جو ''اپنی پڑھائی جاری رکھے ہوئے ہیں وہ ایک جابر حکومت کے استحکام میں مدد دے رہے ہیں اور اس طرح جہاد نہیں کر رہے''۔ وہ مرتد اور موت کے مستحق قرار دیے جاتے ہیں۔

اس سے بڑی دلیل جی آئی اے نے یہ دی کہ الجیریا کا ہر وہ باشندہ جو جی آئی اے کی حمایت نہیں کرتا وہ خاموشی سے حکومت کی مدد کر رہا ہے۔ اس طرح وہ اپنا حق تحفظ برائے غیر لڑاکا کھو رہا ہے۔ جائز اہداف کی فہرست اس طریقے سے طویل کی گئی کہ تقریباً تمام معاشرہ اس میں شامل ہو جاتا ہے۔

قتل و غارت اور خونریزی کے شعلوں نے بین الاقوامی جہادی حلقوں میں ایک مباحثے کا آغاز کیا۔ جی آئی اے کے معاونین اس بات سے پریشان تھے کہ جی آئی اے اپنے حملوں کی مذہبی توجیہات کی وضاحت کے لیے تیار نہیں تھی۔ کچھ حامیوں نے تو شروع میں اسے حکومتی پروپیگنڈہ کہہ کر جی آئی اے کے ان حملوں میں ملوث ہونے سے انکار کیا۔ (اس سلسلے میں ابوحمزہ مصری ایک مثال ہے جس نے آخر کار ۱۹۹۷ء میں تحریک کی حمایت سے دستبرداری اختیار کر لی)۔ لیکن جب یہ واضح ہو گیا کہ الجزائر کے جہادی اس خونریزی میں ملوث تھے تو وسیع پیمانے پر ان کی مذمت ہوئی اور بین الاقوامی جہادی نیٹ ورک نے اس کی مخالفت کی۔ ابوقتادہ جو جی آئی اے کے مفتی سمجھے جاتے تھے، نے بھی خونریزی کے براہِ راست جواب میں جی آئی اے کی حمایت ترک کر دی۔ خونریزی کی غیر اسلامی روایت کی بظاہر مخالفت میں بن لادن نے جی آئی اے کے مخالف GSPC یعنی سلفی گروپ برائے جنگ اور تبلیغ کو مدد فراہم کی جس کی قیادت جی آئی اے کے سابق امیر حسن حطاب کر رہے تھے۔ زوابری بہت زیادہ جدا ہو کے رہ گیا اور جی آئی اے باہم مخالف دھڑوں میں بٹ کے رہ گئی۔ اسے آخر کار فروری ۲۰۰۲ء میں قتل کر دیا گیا۔

بن لادن اور بین الاقوامی جہادیوں کے لیے بنیادی پریشانی یہ تھی کہ ان کے حملوں کا نشانہ کافر نہیں مسلمان تھے۔ اسلامی قانون کے مطابق مسلمان مسلمان کو قتل نہیں کر سکتا سوائے خاص صورت حال میں، مثلاً قصاص میں، لیکن اس کے لیے بھی سخت شرائط ہیں۔ آبادی کے اتنے وسیع حصے کے خلاف تکفیر کے تصور کو بین الاقوامی جہادیوں نے رد کر دیا۔ القاعدہ کے نزدیک حکومت کے مرتدین کو قتل کرنا ایک بات ہے

جبکہ عام مسلمان شہریوں کو حملوں کا نشانہ بنانا بالکل دوسری چیز ہے کیونکہ حکومت اور اس کے سرکاری اہل کاروں نے انہیں گمراہ کیا ہے جو جان بوجھ کر معاملات کو گڈمڈ کر دیتے ہیں اور لوگوں سے اسلامی صداقتوں کو چھپاتے ہیں۔ اس خونریزی نے القاعدہ کے طریق کار کو امریکہ اور اس کے کٹھ پتلی حکمرانوں کے خلاف جنگ میں مسلمانوں کے اذہان وقلوب کو جیتنے کے لیے بھی پُرخطر بنا دیا۔

الجیریا میں عام شہری آبادی کو نشانہ بنانے کے مباحثہ سے نکل کر القاعدہ نے ایک معاصر علماء کی جمعیت کی مدد سے ۱۹۹۰ء میں اپنی پوزیشن مضبوط بنانا شروع کی۔ اس تحریک نے مسلمان شہریوں کو نشانہ بنانے کو بالاتفاق رد کیا جب تک وہ کفار کی معاونت نہ کریں (اس صورت حال میں وہ مسلمان ہی نہیں رہتے)۔ یہ بھی ایک حساس معاملہ تھا کہ مسلمان کافروں پر فائرنگ کے دوران خود بھی شکار ہو سکتے ہیں اس لیے یہ کہا گیا کہ مسلمان غیر مسلموں سے اختلاط نہ رکھیں اور اصلی اہداف سے دور رہیں۔ وہ لوگ جو بلاقصد قتل ہو جاتے ہیں انہیں شہید سمجھا جاتا ہے اور ان کے ورثاء اور خاندانوں کو خون بہا ادا کیا جانا چاہیے۔ خون بہا کی اس رقم کی ادائیگی کی دلیل ایمن ظواہری نے اس وقت پیش کی جب ۱۹۹۳ء میں مصر میں وزیر اعظم عاطف صدقی کے موٹر کیڈ پر حملے کے دوران ایک چھوٹے بچے کو بلاقصد قتل کر دیا گیا۔ یہ حل ان مسلمانوں کے لیے بھی پیش کیا گیا جو گیارہ ستمبر کے حملوں میں قتل ہو گئے تھے۔

غیر مسلم عام شہریوں پر حملوں کے جواز کے لیے جہادی ایک ایسی دلیل پیش کرتے ہیں جس کے دو پہلو ہیں۔ پہلا، وہ ''متناسب جواب کا اصول'' استعمال کرتے ہیں۔ وہ اگرچہ غیر جنگجو لوگوں کو قتل کرنے کی عمومی ممانعت کو قبول کرتے ہیں لیکن جہادی ابن قیم، شوکانی، قرطبی، ابن تیمیہ اور دوسروں سے مسلسل سبق سیکھتے ہوئے یہ دلیل دیتے ہیں کہ کافر عام مسلمان شہریوں کو قتل کرتے ہیں تو ان کے عام شہریوں پر حملے کرنا جائز ہو جاتا ہے۔ قرآن (۲:۱۹۴) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے: ''جو تم پر زیادتی کرے، اس پر زیادتی کرو اتنی ہی جتنی اس نے کی''۔ القاعدہ کے نمائندے سلیمان ابوغیث نے اپنی کتاب ''نیزوں کے سائے'' میں یہ دلیل دی ہے کہ جو شخص بھی ان مصادر پر غور کرتا ہے اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ: ''تمام فقہاء اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ متناسب سزا جس کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے کسی خاص واقعہ سے متعلق نہیں ہے۔ یہ کفار، بکے ہوئے مسلمانوں اور ظالموں کی سزا کے لیے ایک جائز اصول ہے۔ دوسرے الفاظ

میں اگر دشمن ممنوعہ حربے استعمال کرتا ہے تو ان کا استعمال مسلمانوں کے لیے جائز بن جاتا ہے۔

امریکیوں کے خلاف متناسب جواب کے اصول کو روبہ عمل لانے کے لیے جہادیوں کو یہ واضح کرنا پڑتا ہے کہ امریکہ جان بوجھ کر عام مسلمان شہریوں کو قتل کر رہا ہے۔ یہ بات افغانستان اور عراق وغیرہ میں امریکی مدد اور شمولیت سے عام مسلمان شہریوں کے قتل کی بنیاد پر کہی جاتی ہے۔ متناسب جواب کے اصول کے لیے یہ انتہائی لازم ہے کہ امریکہ کے ارادوں کو ٹھوس دلائل کی بنیاد پر ایسا ثابت کیا جائے۔ لیکن ایسا کیے بغیر انتہاء پسند یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ امریکہ کی پالیسی ہی مسلمانوں کو قتل کرنا ہے تاکہ امت اسلامیہ کو دہشت زدہ کر سکے۔ اس دلیل کا زیادہ اطلاق فلسطینی علاقوں اور اسرائیل کے لیے امریکہ کی غیر متزلزل حمایت پر ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ اس وسیع مایوسی کا اظہار ہے جسے لاکھوں مسلمان محسوس کرتے ہیں جب وہ اسرائیلی فوجیوں کے مقابلے کے دوران مقتول بچوں اور عام شہریوں کی تصویروں کو دیکھتے ہیں۔ گیارہ ستمبر کے حملوں کے جواز میں القاعدہ یہ دلیل دیتی ہے:

''امریکہ کی مہربانیوں سے یعنی اس کے مؤثر تعاون کی بدولت ہی نہیں بلکہ اس کی سرگرمیوں کے ذریعے مسلمان قوم کو ختم کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ اس کے بہترین شواہد دنیا کے علم میں وہ واقعات ہیں جو فلسطین کے شہر جنین، نابلوس، رملہ وغیرہ میں ہوتے رہتے ہیں۔ ہر روز وہاں ہونے والی قتل و غارت کو دیکھا جا سکتا ہے۔ امریکی حمایت کے سبب سے بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ کیا مسلمانوں کو اسی انداز میں جواب دینے اور امریکیوں کو اسی طرح قتل کرنے کی اجازت نہیں جیسے وہ مسلمانوں کو قتل کرتے ہیں؟ اللہ کی قسم یقیناً یہ مسلمانوں کا درست حق ہے''۔

القاعدہ کے نزدیک یہ شواہد ایک واضح نتیجہ پر لے آتے ہیں: ''مسلمانوں کو یہ اجازت ہے کہ وہ تحفظ یافتہ کفار کو جوابی عمل کے تحت قتل کر دیں۔ اگر کفار نے مسلمان عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو نشانہ بنایا ہے تو مسلمانوں کو اسی انداز میں جواب دینے کی اجازت ہے کہ کفار کے ان عام لوگوں کو قتل کریں جس طرح مسلمانوں کے عام لوگوں کو کفار نے قتل کیا ہے''۔

سلیمان ابوغیث کے نزدیک مسلمانوں کی بھاری تعداد کو امریکہ نے قتل کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ کی برابری کے لیے مسلمانوں کو چالیس لاکھ امریکیوں کو مارنے کا حق حاصل ہے۔

متناسب جواب کے اصول کا استعمال القاعدہ کی ان تشریحات پر مبنی ہے جو امریکہ کے ارادوں کے بارے میں ہیں: کیا امریکی فوجی جان بوجھ کر عام شہریوں کو نشانہ بنا رہے ہیں؟ اگر سوال کا جواب ہاں میں ہے تو غیر متشدد سلفی بھی اس بات سے اتفاق کریں گے کہ عام امریکی شہریوں کو نشانہ بنانا جائز ہے۔ اگر اس کا جواب نہ میں ہے تو مسلمانوں کو ان کے دینی احکامات عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور غیر لڑاکا شہریوں کو قتل کرنے سے سختی سے منع کرتے ہیں۔ جب پتھر پھینکنے والے فلسطینی بچوں کو اسرائیلی فوجی مار ڈالتے ہیں تو اکثر مسلمان اس دلیل کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ اسرائیل جان بوجھ کر عام شہریوں کو نشانہ بناتا ہے۔ اس سوچ میں اتنا اضافہ ہو رہا ہے کہ اکثر لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ خود امریکہ بھی یہ کر رہا ہے۔ مثلاً کچھ لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ امریکی ٹیکنالوجی اتنی طاقتور ہے کہ وہ واحد طریقہ جس سے عام شہریوں کو قتل کیا جا سکتا ہے وہ امریکیوں کا عمداً انہیں نشانہ بنانا ہے۔ اس طرح القاعدہ کے پاس امریکی فوجی طاقت اور جنگ کے باہمی نقصان کے حوالے سے پریشانی اور مایوسی پھیلانے کے لیے وسیع میدان موجود ہے۔

اس دلیل کا دوسرا بڑا پہلو ابن تیمیہ کی فکر پر مبنی ہے جس نے یہ دلیل دی کہ ''چونکہ جائز جنگ لازماً جہاد ہے اور چونکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ دین سارے کا سارا اللہ کا ہے اور اللہ کا کلام سب سے اوپر ہے اس لیے مسلمانوں کے مطابق وہ لوگ جو اس مقصد تک پہنچنے کے راستے میں رکاوٹ بنیں گے ان سے جنگ ضروری ہے۔ ہاں وہ لوگ جو مزاحمت نہیں کر سکتے یا لڑ نہیں سکتے مثلاً عورتیں، بچے، راہب، بوڑھے، اندھے، معذور وغیرہ انہیں قتل نہیں کیا جائے گا جب تک وہ درحقیقت پروپیگنڈے، جاسوسی یا کسی بھی طریقے سے جنگ میں شریک نہ ہوں''۔ یہ دلیل دشمن آبادی کی بلحاظ استطاعت جنگ کی وضاحت کر دیتی ہے یعنی کون ''عام شہری'' کی تعریف میں داخل ہوگا اور کون نہیں۔

جہادی یہ دلیل دیتے ہیں کہ ہر وہ شخص جو دشمن کی کسی بھی طریقے سے مدد کرتا ہے وہ غیر جنگجو کے تحفظ کے کی رعایت کو کھو بیٹھتا ہے: ''مسلمانوں کے لیے تحفظ دیے گئے کفار کو قتل کرنا اس شرط پر جائز ہے کہ انہوں نے جنگ میں مدد فراہم کی ہو چاہے یہ مدد کسی کام، بات، افکار یا مدد کی کسی بھی صورت میں ہو''۔ اس انداز دلیل کے لیے شاید سب سے زیادہ پیش کی جانے والی بنیاد دُرید ابن الصمہ کی روایت ہے۔ دُرید ایک مشہور عرب شاعر تھا جس نے محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] اور اس کے پیغام اسلام کی شدید مخالفت کی

تھی۔ روایت کے مطابق ہوازن کے فوجیوں کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لیے ترغیب دلانے کے لیے اسے میدان جنگ میں لایا گیا۔ اگرچہ وہ ایک عمر رسیدہ بوڑھا شخص تھا اور مسلمان فوج کو اس سے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن اس نے جو خفیہ معلومات دشمن کو پہنچائیں ان کی وجہ سے وہ بھی حملے کا ایک ہدف بن گیا اور اسے میدان جنگ میں قتل کر دیا گیا۔

اگرچہ غیر متشدد سلفی بھی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ وہ افراد جو جنگ کی منصوبہ بندی یا معاون امور میں مشوروں کے ذریعے جنگ میں براہِ راست مدد کریں وہ بھی حملوں کا جائز نشانہ ہیں لیکن القاعدہ حملوں کے اہداف کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے بڑے عجیب انداز میں ''لڑنے کی اہلیت'' رکھنے والے عوام کو موضوع فکر بناتی ہے۔ جس کسی کو بھی تحریک خود ''اسلام کے خلاف جنگ'' میں معاون خیال کرتی ہے وہ بشمول این جی اوز، صحافی، علماء، حکومت کے مشیر اور تاجروں کے، اس کے حملوں کا جائز نشانہ ہیں۔

بہت اہم نیا انداز فکر جس کی اسلام میں کوئی نظیر نہیں ملتی وہ ایک جمہوریت میں ذاتی اور انفرادی اہلیت کی جہادی دلیل ہے۔ اس دلیل کو بہترین انداز میں گیارہ ستمبر کے بارے میں حمود العقلا شعیبی کے ایک فتویٰ میں پیش کیا گیا ہے۔ شعیبی کو جہادیوں کا سرپرست سمجھا جاتا ہے۔ اپنے فتویٰ میں شعیبی نے یہ دلیل دی:

''ہمیں جاننا چاہیے کہ ایک غیر مسلم ملک امریکہ جو بھی فیصلہ کرتا ہے بالخصوص وہ بہت اہم فیصلے جو جنگوں کو شامل ہیں، یہ سب ایوانِ نمائندگان اور سینٹ کے اندر ووٹنگ اور رائے عامہ پر مبنی ہوتے ہیں اور یہ براہِ راست کانگریس میں اپنے نمائندوں کے ذریعے عام امریکی آبادی کی ہو بہو رائے ہوتی ہے۔ اس حقیقت کی بنیاد پر جس امریکی نے بھی جنگ کے لیے ووٹ دیا وہ ایک جنگجو ہے یا کم از کم جنگ کا حامی ہے''۔

ابن تیمیہ کے موقف کے مقابلے میں دشمن آبادی کی لڑنے کی اہلیت کا حوالہ دیتے ہوئے العقلا ایک اور فیصلے کا حوالہ بھی دیتا ہے جس میں ابن تیمیہ نے یہ دلیل دی تھی کہ عیسائیوں سے لڑا جا سکتا ہے کیونکہ ''انہوں نے مسلمانوں کے دشمنوں کی اپنے مال اور ہتھیاروں سے معاونت اور مدد کی تھی باوجود یہ کہ

وہ بذات خود ہم سے نہیں لڑے تھے''۔ العقلا کے موقف نے اس کے بعض انتہاء پسند شاگردوں کو بہت متاثر کیا بشمول علی بن خُضیر الخُضیر، ناصر حماد الفہد اور سلیمان علوان۔ علوان اور خُضیر نے گیارہ ستمبر کے بعد یہ کہنے کے لیے فتویٰ جاری کیا کہ ہر وہ شخص جس نے امریکہ کی مدد کی ایک مرتد ہے۔ الفہد نے وسیع پیمانے پر تباہی کے ہتھیاروں کے استعمال کی حمایت میں ایک فتویٰ جاری کیا۔

اس قسم کی دلیل القاعدہ کی شائع کردہ کتب میں بکثرت پائی جاتی ہے۔ گیارہ ستمبر کے حملوں کے جواز میں تحریک یہ دلیل دیتی ہے کہ چونکہ جمہوری طور پر منتخب حکومت عوام کی رضامندی کی عکاسی کرتی ہے اس لیے اسلام کے خلاف جنگ کو لازماً بہت بڑی عوامی تائید حاصل ہے۔ ''الرائی العام'' کی اصطلاح کا استعمال جمہوریت میں لوگوں کے ارادے کی نمائندگی کو پیش کرتا ہے۔ القاعدہ یہ دلیل دیتی ہے:

> ایک مسلمان کے لیے یہ سوچنا حماقت ہے کہ صلیبی صیہونی عوامی رائے جو اپنی حکومت کی پشت پناہی کرتی ہے وہ اسلام کے خلاف صلیبی جنگ کی حمایت کے لیے مسلمانوں کی کسی کارروائی کا انتظار کر رہی تھی تاکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنی کی روح کو بھڑکایا جا سکے۔ صلیبی اور صیہونی عوامی رائے نے صلیبی اقوام کی پشت پناہی کے لیے اپنا سب کچھ لگا دیا ہے تاکہ وہ اسلامی ممالک کو نوآبادیاں بنانے کے وقت سے لے کر آج تک اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جنگ لڑ سکیں۔ اگر یکے بعد دیگرے آنے والی صلیبی صیہونی حکومتوں کو اپنی عوام سے حمایت حاصل نہ ہوتی تو وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اتنی واضح اور کھلم کھلا صورت حاصل نہ کر سکتی۔ یہ ایک ایسا کام ہے جو لوگوں کی موافق رائے کے بغیر جواز نہیں پا سکتا۔

عبدالعزیز بن صالح الجربو جس نے ''امریکہ کو تباہ کرنے کے دینی جواز کی بنیادیں'' (Basing the Religious Legitimacy of Destroying America) نامی کتاب لکھی۔ وہ ایک کہانی دہراتا ہے جس میں نبی [صلی اللہ علیہ وسلم] نے اپنے صحابہ کو ایک ایسی خاتون کو قتل کر دینے کا حکم دیا تھا جس نے دشمن کے جنگجوؤں کے جذبات ابھارنے کے لیے گیت گائے تھے۔ اس سے وہ یہ دلیل اخذ کرتا ہے کہ: ''اگر یہ حکم ایسے شخص کے خلاف ہے جس نے رسول [صلی اللہ علیہ وسلم] کے خلاف گالی گلوچ والے گیت گائے تھے تو یہی حکم بدرجۂ اتم ان سب کے لیے ہوگا جو مسلمانوں کے قتل عام کو منظور کرنے کے

لیے ووٹوں سے شرکت کرتے ہیں اور ان لوگوں کے خلاف بھی جو اسلام اور مسلمانوں میں فحاشی اور بدکاری پھیلاتے ہیں''۔

یہ واضح ہے کہ ابن تیمیہ نے جمہوری نظام حکومت میں رہنے والے افراد کے قصور اور سزاؤں سے بحث نہیں کی ہے کیونکہ یہ قرون وسطیٰ یا صدر اسلام کے دور کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ جہادیوں نے اس کی دلیل اور اثبات مسئلہ کو جو اسلامی فقہ میں ایک مسلم اصول ہے، بدل کر رکھ دیا ہے۔ اصول یہ ہے کہ وہ لوگ جو لڑائی میں مدد کرتے ہیں یہاں تک کہ اگر وہ فوجی نہ بھی ہوں پھر بھی وہ حملے کے جائز اہداف ہیں۔ القاعدہ نے چالاکی سے اس اصول کی موضوعی نوعیت کو بدلتے ہوئے تمام امریکیوں کو ذاتی طور پر صرف اس لیے ذمہ دار قرار دے دیا کہ وہ ایک جمہوری ملک میں رہتے ہیں اور اس طرح نہ لڑنے والے شہریوں پر بڑے پیمانے کے حملوں کو جائز قرار دیا۔

اگرچہ جی آئی اے کے امیر زوابری (Zouabri) کو کبھی بڑا دینی عالم نہیں سمجھا گیا اور عام شہریوں کو نشانہ بنانے کی مذہبی بحث پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں تھا پھر بھی الجیریا میں قتل عام کے لیے اس کا استدلال القاعدہ کے گیارہ ستمبر کے حملوں کے جواز کی بنیاد ہے۔ دونوں صورتوں میں عام شہری کی تعریف کو کھینچ تان کر اتنا وسیع کر دیا گیا کہ آبادی کے تمام لوگ اس کے اندر آجاتے ہیں۔ اس لیے جہاں القاعدہ نے الجیریا میں عام مسلمان شہریوں کے قتل پر اعتراض کیا تھا وہاں غیر مسلموں کو قتل کرنے کی اس کی دلیل میں زوابری کے استدلال کی عکاسی ہوتی ہے۔

خودکش حملے

عام شہریوں کو نشانہ بنانے کی طرح خودکش حملے یا ''شہادت آپریشن'' بھی نسبتاً جدید طریقے ہیں۔ مسلمانوں کی جانب سے خودکش حملوں کا استعمال لبنان سے شروع ہوا اور اسے حزب اللہ نے مقبول عام بنایا۔ حکمت عملی کے نقطۂ نظر سے بات ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ اس طریقے نے فلسطینی گروپوں کو بہت متاثر کیا۔ تاہم بات اگر دینی حوالے سے ہو تو یہ کہنا درست نہ ہوگا۔ حزب اللہ نے براہِ راست القاعدہ اور سنی جہادیوں پر اثرات مرتب کیے کیونکہ اس کے دلائل شہادت کے بارے میں شیعی روایات سے ماخوذ ہیں

(اوران کی توجہ فوجی اور سیاسی اہداف پر ہے)۔ سلفیوں میں اس قسم کے آپریشنز کے دینی جواز کی حقیقی بحث اصل میں ۱۹۹۰ء کے وسط سے قبل سامنے نہیں آئی تھی اور یہ بحث بھی اس وقت شروع ہوئی جب حماس اور دیگر فلسطینی گروپوں کی طرف سے ان حربوں کا استعمال کثرت سے کیا جانے لگا۔

خودکش حملوں کے بارے میں جہادیوں کے تازہ ترین دلائل سے متعلق دلچسپ بات یہ ہے کہ ایسے حملوں کے جواز کے لیے دینی دلیل کی تشکیل کے وقت اسے بہت ہی کم توجہ دی گئی ہے۔ اس کی بجائے بھاری لٹریچر شہادت کے فضائل کے بارے میں ہے۔ اس سلسلے میں عبداللہ عزام کی کتاب ''اللہ کے راستے میں شہادت کے فضائل'' ایک عمدہ مثال ہے۔ اس میں وہ شہادت کے فوائد سے متعلق ستائیس نکات بالوضاحت پیش کرتے ہیں۔ اکثر تحریریں یہ دلیل دیتی ہیں کہ شہید کو جنت میں ایک گھر ملے گا، وہ عذاب قبر سے محفوظ ہوگا، وہ سیاہ آنکھوں والی ستر کنواریوں سے شادی کرے گا اور اپنے رشتہ داروں میں سے ستر کی شفاعت کر سکے گا۔ مسلمان علماء شہادت کے فضائل سے متعلق دینی ترغیبات پر متفق ہیں۔

۱۹۹۰ء سے القاعدہ اور جہادیوں کو دو مرکزی سوالوں پر توجہ دینی پڑی ہے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ کیا شہادت مہم کا حملہ خودکشی ہے؟ یہ کافی مشکل سوال ہے کیونکہ اسلام واضح طور پر خودکشی سے منع کرتا ہے۔ سعودی عرب کے چند بڑے سلفی علماء نے یہ دلیل دی ہے کہ ایسے حملے ممنوع ہیں۔ مثلاً محمد بن صالح بن عثیمین (م ۲۰۰۰ء) نے کہا کہ ''جہاں تک ان امور کا تعلق ہے جن میں لوگ اپنے جسم کے ساتھ دھماکہ خیز مواد باندھتے ہیں اور پھر کفار کے قریب جا کر اچانک دھماکہ کر دیتے ہیں تو یہ معاملہ خودکشی ہے---۔ لہٰذا جو کوئی بھی خودکشی کرے گا وہ ابدی طور پر جہنم میں جائے گا''۔ اس مذمت میں توجہ خود عمل پر ہے یعنی خود کو عمداً قتل کرنے پر۔

تاہم جہادی اس مجاہد کی نیت پر توجہ مرکوز کرواتے ہیں۔ چاہے وہ اتنا انتہاء پسند نہ بھی ہو جتنا القاعدہ والے ہیں، یوسف قرضاوی نے بنیادی دلیل کا خاکہ یوں پیش کیا ہے:

> وہ شخص جو خودکشی کرتا ہے وہ اپنے فائدے کے لیے خود کو قتل کرتا ہے جبکہ جو خود کو شہید کرتا ہے وہ اپنے دین اور قوم کی خاطر خود کو قربان کرتا ہے۔ جبکہ خودکشی کرنے والا خود اپنے آپ سے اور اللہ سے امید کھو چکا ہوتا ہے لیکن مجاہد اللہ کی رضا اور رحمت سے پُر امید ہوتا ہے۔ وہ اس نئے ہتھیار کے

ساتھ اپنے اور اللہ کے دشمن سے لڑتا ہے، جسے قسمت نے کمزور کے ہاتھ میں تھما دیا ہے تا کہ وہ طاقتور اور متکبر کی برائیوں کے خلاف لڑ سکیں۔ مجاہد ایک ''انسانی بم'' بن جاتا ہے جو ایک خاص وقت اور جگہ پر اللہ اور اپنے وطن کے دشمنوں کے درمیان پھٹتا ہے اور دشمن اس بہادر شہید کے سامنے بے بس رہ جاتے ہیں جس نے اپنی جان اللہ کے ہاتھ فروخت کر دی ہوتی ہے اور اللہ کی رضا کی خاطر شہادت طلب کی ہوتی ہے۔

یہاں القاعدہ والے خودکش حملوں کے بحیثیت جائز شہادت آپریشنز کے نظریے پر نسبتاً کم انتہا پسند سنی قدامت پرستوں نے متفق نظر آتے ہیں۔ ان میں نہ صرف قرضاوی جیسی شخصیات شامل ہیں بلکہ مصر کے شیخ الازہر محمد سید طنطاوی بھی شامل ہیں۔ اس طرح جہادیوں کو ایسے حربوں کے لیے مسلمانوں سے کافی حمایت مل جاتی ہے۔

دوسرا سوال اہداف سے متعلق ہے۔ کیا مسلمان جنگجو ''شہادت آپریشنز'' میں عام شہریوں کو قتل کر سکتے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں جہادی دلیل کا اکثر حصہ عمومی طور پر عام شہریوں کو قتل کرنے کے جواز پر مبنی ہے جسے اس مقالے کے سابقہ حصے میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اگرچہ کوئی شخص طنطاوی کی طرح اصولی طور پر خودکش حملوں کی حمایت کر سکتا ہے لیکن وہ اور دوسرے علماء خودکش حملے کے دوران عام شہریوں کو قتل کرنے پر اعتراض کرتے ہیں۔ اردن کے ایک بہت انتہاء پسند جہادی سلفی محمد المقدسی نے بھی عام شہریوں کو نشانہ بنانے سے متنبہ کیا ہے تاہم یہ واضح ہے کہ بعض صورتوں میں مسلمان مجاہد لڑاکا اور غیر لڑاکا شہریوں میں فرق کرنے کے قابل نہیں ہو پاتا۔ اس تناظر میں مجموعی نقصان جائز ہے لیکن جہاں ممکن ہو اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

یہ اس اجماعِ عام کے باعث ہے کہ مسلمان غیر فوجی شہریوں کو عمداً نشانہ نہیں بنا سکتے۔ اس پر القاعدہ اور دوسرے زور دے کر کہتے ہیں کہ ''مزعومہ'' عام شہری درحقیقت غیر لڑاکا نہیں ہیں۔ مثلاً اسرائیل کے تناظر میں قرضاوی اور جہادی اسرائیل کو ایک فوجی ملک کہتے ہیں کیونکہ اس میں عورتوں اور مردوں سب کے لیے فوجی تربیت اور عملی فوجی خدمات لازمی ہیں جو بعد میں ریزرو فوج کا کام دیتے ہیں۔ اس لیے شہادت مہمات میں وہ بھی جائز اہداف بن جاتے ہیں۔ کچھ زیادہ ہی انتہاء پسند عناصر یہ دلیل دیتے ہیں کہ

چونکہ بچے بھی بڑے ہو کر اسرائیلی فوج میں خدمات سرانجام دیں گے اس لیے وہ بھی جائز اہداف ہیں۔ بحث اور اس میں مختلف دلیلوں سے قطع نظر القاعدہ ''اعمال، الفاظ اور فکر'' کے ذریعے جنگ لڑنے والے شہریوں کو اپنے حملوں کا اہداف بنانے میں بڑی محتاط ہے۔

ماحصل اور مستقبل کی توقعات

جہادی فکر کا ارتقاء ان حدود اور رکاوٹوں کے خاتمے کی وجہ سے ہوا ہے جو کلاسیکل اسلام میں جنگ اور تشدد کو محدود کرنے کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہیں۔ تاریخ اسلام میں اکثر مسلمان علماء نے مرتد کی تعریف یہ کی ہے کہ جو شخص کھلے اعلان کے ساتھ خود کو غیر مسلم کہہ کر یا ارکان اسلام (نماز، محمد [صلی اللہ علیہ و سلم] کی نبوت، توحید وغیرہ) کو ترک کر کے ایمان کو چھوڑتا ہے وہ مرتد ہے۔ جبکہ جہادی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ لیڈر جو احکام اسلامی کا نفاذ نہیں کرتا اور ان کی پیروی نہیں کرتا مرتد ہے۔ ہرگاہ کہ اکثر علماء اپنے حکمرانوں کو جب تک وہ نماز کی اجازت دیتے ہیں اور اپنے دلوں میں رائی کے دانے کے برابر ایمان بھی رکھتے ہیں، ہٹانے کے لیے متشددانہ سرگرمیوں کو رد کرتے ہیں لیکن جہادیوں کا ایمان یہ ہے کہ وہ حکمران جو انتہاء پسندوں کی تشریح کے مطابق اسلام کو نافذ کرنے سے انکار کرتا ہے اس کے خلاف جہاد کا آغاز کرنا فریضۂ الٰہی ہے۔ ہرگاہ کہ مستند اسلام کی پوری تاریخ میں اس بات پر اجماع پایا جاتا ہے کہ جنگ کے دوران عام شہریوں کو نشانہ نہیں بنایا جائے گا لیکن القاعدہ نے ''عام شہری'' کی تعریف اس انداز میں کی ہے کہ جس کی رو سے مغربی جمہوریت کے تحت رہنے والا ہر شخص حملے کا جائز نشانہ ہے۔ لہٰذا متناسب جواب کے اصول کے تحت مسلمانوں پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ بھی لاکھوں کروڑوں امریکیوں کو قتل کریں۔ اگرچہ خودکش حملوں کے استعمال کو وسیع حمایت حاصل ہے پھر بھی القاعدہ نے صرف فوجی اور سیاسی لیڈروں کو نشانہ بنانے کی بجائے خودکش حملوں کے نشانوں میں مغربی ممالک کے عام شہریوں کو بھی شامل کر لیا ہے۔

مندرجہ بالا معروضات سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہادیوں کے اہداف کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا اور مختلف درجات کے لوگوں کی بڑی اکثریت ان کے اہداف کے دائرے میں آ جائے گی۔ اس کے شواہد پاکستان اور سعودی عرب میں شیعوں پر حملوں کی صورت میں پہلے ہی سے موجود ہیں۔ اور عراق میں بھی

ایک حد تک کیونکہ زرقاوی کے ارادے یہ ہیں کہ سُنی اور شیعہ آپس میں نہ ملیں۔ متعدد انتہاء پسندوں نے ۱۹۹۰ء کے عشرے کے اوائل سے شیعوں کو قتل کرنے کے اپنے ارادوں کا اعلان کر دیا تھا اور اب تک یہ ایک عام صورت حال بن چکی ہے۔ سرکاری اور حکومتی اہل کاروں کے ساتھ ساتھ سُنی طبقے کے لوگوں پر بھی اس قسم کے مزید حملے متوقع ہیں۔

تاہم یہ اپنا کھیل کھیل چکے ہیں۔ جہادی فکر کے ارتقاء کا نتیجہ ایک وسیع تشدد رہا ہے نہ کہ محدود۔ بالآخر القاعدہ کے لیے عام حمایت ختم ہو جائے گی جس طرح الجیریا میں شدید تشدد کی وجہ سے جی آئی اے کو مسترد کر دیا گیا تھا۔ لیکن اسی دوران لوگوں کے مزید گروپ جہادیوں کے جائز اہداف کی فہرست میں شامل ہو سکتے ہیں۔ جہادیوں کی ''متناسب جواب'' کی دلیل کے پیش نظر اور وسیع پیمانے پر تباہی کے ہتھیاروں کے حصول کی ان کی نیت کے پیش نظر حملے زیادہ تعداد میں اور زیادہ خطرناک بھی ہو سکتے ہیں۔

[مصنف کونٹان وِکٹر وز امریکہ میں رھوڈز کالج کے شعبہ بین الاقوامی مطالعات میں استاد ھے۔]